الرسالہ

Al-Risāla

June 1998 • No. 259 • Rs. 8

جہاں معیاری حل ممکن نہ ہو وہاں عملی حل پر راضی ہو جانا
دانش مندی کی سب سے زیادہ یقینی پہچان ہے
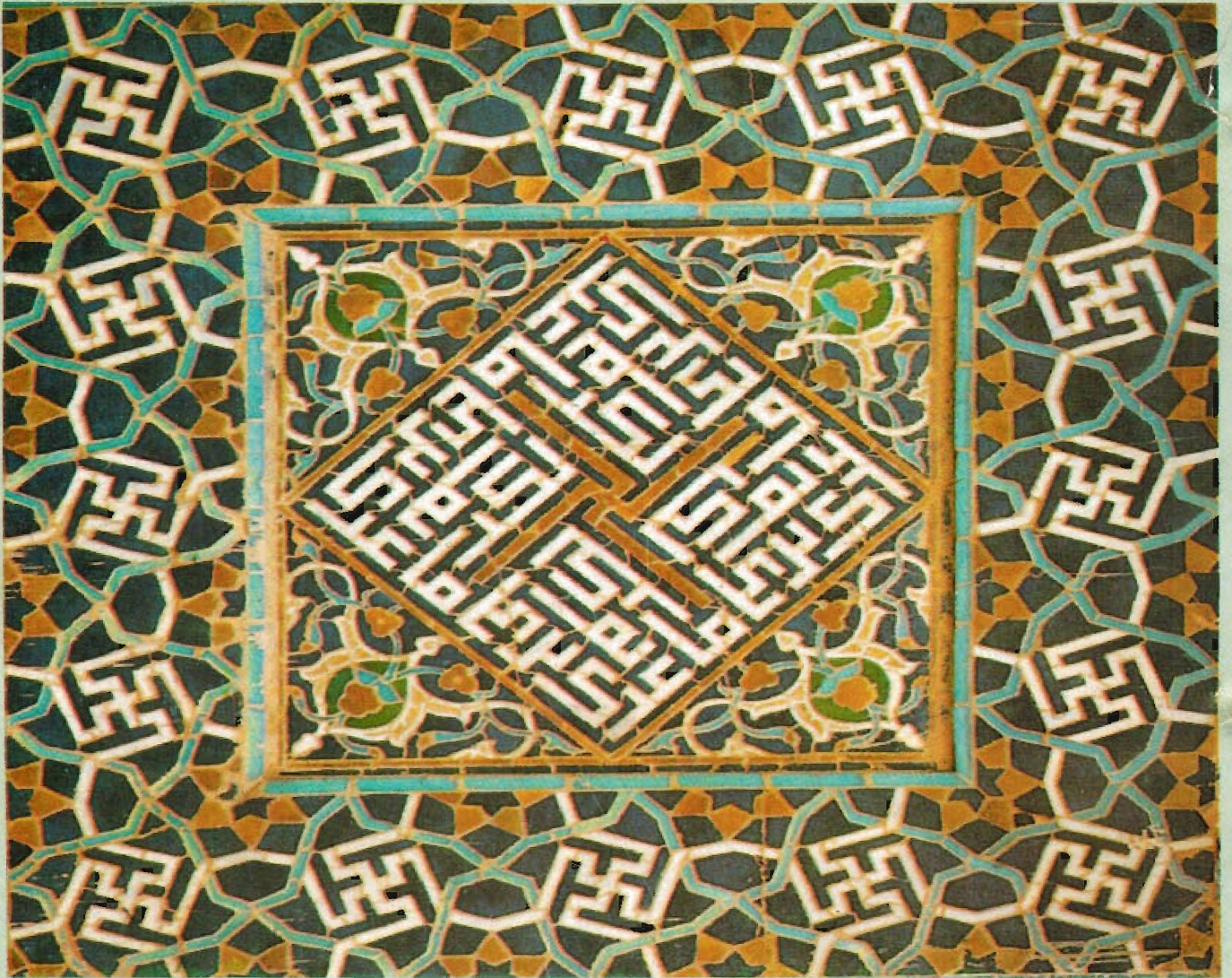
Size 22×14.5cm, 88 pages
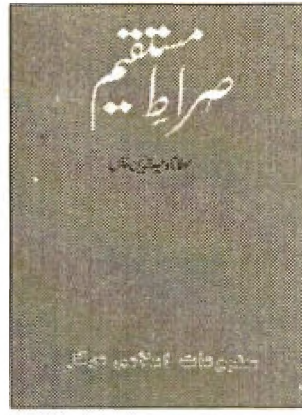
Size 22×14.5cm, 200 pages
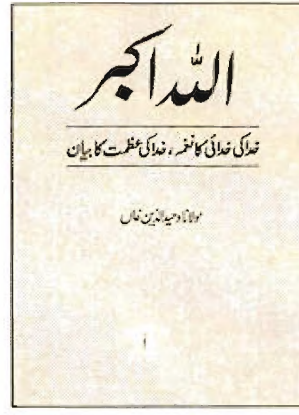
Size 22×14.5cm, 288 pages
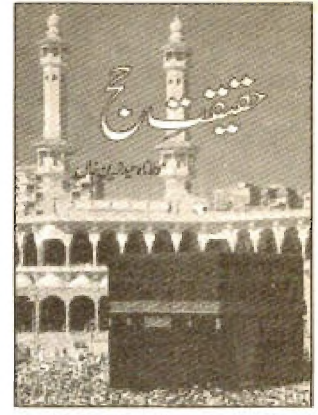
Size 22×14.5cm, 116 pages
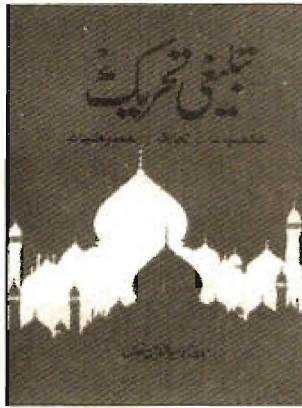
Size 22×14.5cm, 96 pages
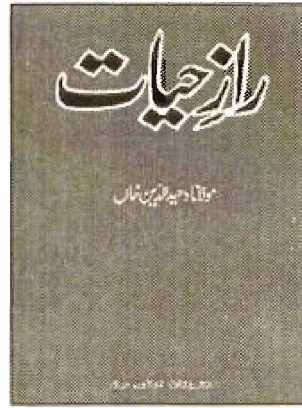
Size 22×14.5cm, 292 pages
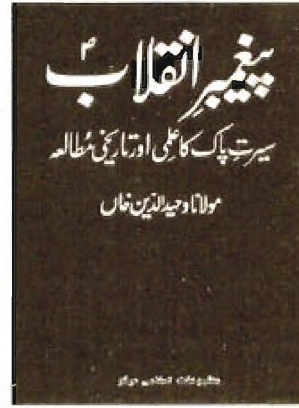
Size 22×14.5cm, 208 pages

Size 22×14.5cm, 264 pages
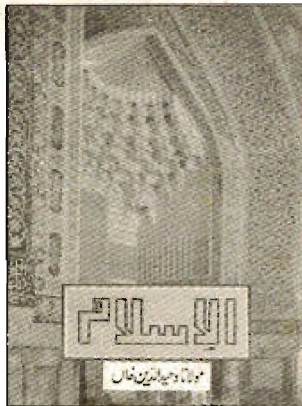
Size 22×14.5cm, 176 pages
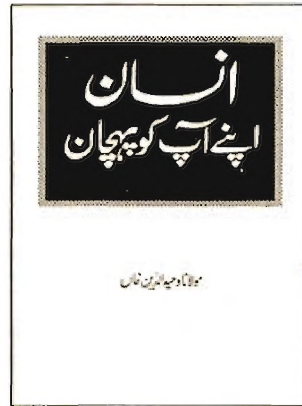
Size 22×14.5cm, 24 pages
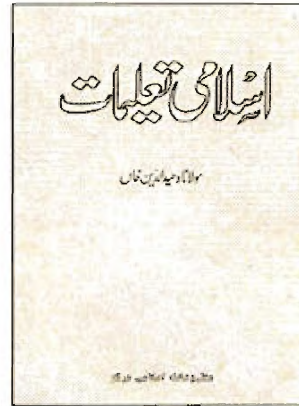
Size 22×14.5cm, 144 pages

Size 22×14.5cm, 160 pages

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of
The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

جون ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۹

حکمت کا سرچشمہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جب بھی کوئی بندہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے دل میں حکمت اُگا دیتا ہے۔ اور اس کی زبان پر حکمت جاری کر دیتا ہے۔ اور اس کو دنیا کا عیب اور اس کا مرض اور اس کا علاج دکھا دیتا ہے، اور اس کو حفاظت کے ساتھ سلامتی کے گھر تک پہنچا دیتا ہے (ما زهد عبدٌ في الدنيا إلّا أنبت الله الحكمة في قلبه، وانطق بها لسانه، وبصّره عيب الدنيا وداءها ودواءها، واخرجه منها سالمًا الى دار السلام) البیہقی بحوالہ مشکاۃ المصابیح، صفحہ ۱۴۳۵

حکمت کیا ہے، حکمت دراصل حقیقت پسندی اور دور اندیشی کا دوسرا نام ہے۔ کسی شخص کا ذہنی ارتقاء جب اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ مسائل کا بے لاگ جائزہ لے سکے اور ان کے بارہ میں گہری بنیادوں پر فیصلہ کرنے لگے تو اسی کا نام حکمت ہے۔

اس حکمت کا سرچشمہ دنیا سے بے رغبتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے اوپر دنیا کی کسی چیز کی محبت اتنی غالب آتی ہے کہ وہ اس کو باتوں کی حقیقت سمجھنے کے لیے اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی تجربہ اس کو کچھ لوگوں کے معاملہ میں بغض کی نفسیات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے بغض کی بنا پر اس قابل نہیں رہتا کہ وہ معاملہ کو اس کی اصل صورت میں دیکھ سکے۔

جو آدمی اس قسم کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں۔ وہ ان کے بارے میں وہی رائے قائم کرے جو ازروئے حقیقت ہونا چاہیے۔ ان کے مقابلہ میں وہ وہی صحیح ترین روش اختیار کرے جو حق اور انصاف کا تقاضا ہے۔

زہد یا دنیا سے بے رغبتی آدمی کو بے پناہ بنا دیتی ہے۔ ایسا آدمی عقلی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ انسان ہوتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ حقیقت پسند ہوتا ہے اور اپنے اقدام کے بارے میں سنجیدہ اور محتاط۔ جو لوگ اس بلند کردار کے حامل ہوں ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں اور آخرت میں بھی کامیاب۔

زہد ترک دنیا نہیں، وہ ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

حالات کی رعایت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو آپ کو خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ایک خدا کی عبادت کرو اور خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ فوراً کھلے مقامات پر جائیں، سب کے سامنے نماز پڑھیں یا بلند آواز سے لوگوں کو خدا کی طرف پکارنا شروع کر دیں۔ اس کے برعکس آپ نے ابتدائی چند سال تک چھپ کر نماز پڑھی اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ خفیہ انداز میں تبلیغ کی۔

یہ حالات کی رعایت تھی۔ حالات کی رعایت اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ قرآن و حدیث میں کوئی حکم مطلق انداز میں دیا گیا ہو تب بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارے حالات کے لحاظ سے اس کی تعمیل کا حکیمانہ طریقہ کیا ہے۔ حالات کے اعتبار سے جو قابلِ عمل صورت ہو اسی کے مطابق حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے آزادانہ انداز اختیار کرنا نہ اسلام کا طریقہ ہے اور نہ پیغمبر اسلام کی سنت۔

اس طریقہ کو دوسرے الفاظ میں فطری طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دنیا میں کسی بھی معاملہ میں نتیجہ خیز جدوجہد وہی ہو سکتی ہے جس میں حالات کی پوری رعایت شامل ہو۔ حالات کی رعایت نہ کرنا فطرت سے ٹکرانا ہے اور فطرت سے ٹکرانے کی تعلیم اسلام میں نہیں دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ سال کی پیغمبرانہ مدت میں اسی طرح حالات کی رعایت سے کام کیا۔ آئندہ بھی آپ کے ماننے والوں کے لیے یہی صحیح طریقہ ہے کہ وہ جس ماحول میں ہوں اس کو سمجھیں اور اس کو بخوبی سمجھ کر حالات کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ اس کے بغیر انھیں خدا کی نصرت نہیں مل سکتی۔

حالات کی رعایت، دوسرے لفظوں میں فطرت کی رعایت ہے۔ اس دنیا کے خالق نے جس قانون کے تحت اپنی دنیا کو بنایا ہے، اس سے مطابقت کرنے کا نام حالات کی رعایت ہے۔ یہ رعایت کسی مقصد میں کامیابی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے، خواہ وہ مقصد دین سے تعلق رکھتا ہو یا دنیا سے۔

نظرانداز کرنا

پیغمبر اسلام مکہ میں ۱۳ سال رہے۔ اس مدت میں وہ تقریباً روزانہ کعبہ میں جاتے تھے۔ وہاں اس وقت ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ یہ عربوں کے مختلف قبائل میں پوجے جانے والے بت تھے۔ مکہ کی مرکزیت قائم کرنے کے لیے اہل مکہ کے سرداروں نے یہ تمام بت کعبہ میں اکٹھا کر دیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ ان کو دیکھتے تھے مگر مکی دور میں کبھی آپ نے ان کو توڑنے یا پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔

اس سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ وقت سے پہلے کوئی کام نہ چھیڑا جائے۔ مکی دور میں آپ نے ان بتوں کو نظرانداز کیا۔ مگر بعد کو جب مکہ فتح ہو گیا تو آپ نے فوراً ان کو نکال کر کعبہ کو ان مشرکانہ علامتوں سے پاک کر دیا۔

اسلام میں اقدام کرنا بھی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسلام میں نظرانداز کرنا بھی ہے۔ اقدام کے وقت اقدام کرنا ضروری ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ جہاں اقدام کا موقع نہ ہو وہاں سختی کے ساتھ نظرانداز کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی سنگین یا اشتعال انگیز معاملہ کیوں نہ ہو۔

حال میں کسی مسئلہ کو اعراض کے خانہ میں ڈالنا مستقبل میں اس کے حل کا دروازہ کھولنا ہے۔ اور بے وقت اقدام کرنا حال اور مستقبل دونوں میں صرف نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

نظرانداز کرنے کی پالیسی دراصل انتظار کرنے کی پالیسی کا دوسرا نام ہے۔

نظرانداز کرنا ایک دانش مندانہ پالیسی ہے۔ نہ کہ کسی قسم کی بزدلی۔ نظرانداز کرنا دوسرے لفظوں میں نظامِ فطرت سے مطابقت ہے۔ اور نظرانداز نہ کرنا، نظامِ فطرت کے خلاف جنگ۔ کوئی شخص یا گروہ اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ فطرت سے لڑ کر کامیاب ہو سکے۔ اس دنیا میں ہر ایک کے لیے صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ نظامِ فطرت سے مطابقت رکھنا ہے۔ اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کسی کے لیے حقیقی کامیابی ممکن نہیں۔

نظرانداز کرنا بے عملی نہیں، نظرانداز کرنا باعمل انسان کا ایک اصول ہے۔

کرائٹیرین کا مسئلہ

کرائٹیرین (معیار) کا مسئلہ بے حد اہم مسئلہ ہے۔ بیشتر فکری گمراہیاں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں کرائٹیرین واضح نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو صحیح سمجھ رہا ہوتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو جانچنے کے لیے غلط کرائٹیرین استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی بات کو درست کرائٹیرین پر جانچے تو وہ جان لے گا کہ اس کی سوچ صد فی صد غلط ہے۔

مثال کے طور پر خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت عمر فاروقؓ کو امیر المومنین مقرر کیا تو بیشتر صحابہ اس رائے سے اتفاق نہ کر سکے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عمر ایک سخت گیر انسان ہیں اور سخت گیر انسان کو امیر المومنین نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ سخت گیر ہیں مگر "سریرته خیر من علانیته" ان کا اندر ان کے باہر سے بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ عمر فاروق کی امارت کے مخالف تھے وہ اپنی رائے کے حق میں غلط کرائٹیرین استعمال کر رہے تھے۔ امیر کے لیے اصل کرائٹیرین یہ نہیں ہے کہ وہ سخت ہے یا نرم۔ اس کے بجائے اصل کرائٹیرین یہ ہے کہ وہ نیک نیت ہو۔ وہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ وہ اپنے اندر بصیرت کی صفات رکھتا ہو۔ وہ حق اور ناحق میں فرق کرنا جانتا ہو۔

صحیح کرائٹیرین (معیار) کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ خلافت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا انتخاب نہایت درست تھا۔ کیوں کہ خلیفہ کی سب سے اہم صفت اس کا مدبر ہونا ہے، اور یہ صفت ان کے اندر پوری طرح موجود تھی۔ اس کے برعکس اگر اس معاملے کو غلط کرائٹیرین سے دیکھا جائے تو ایک شخص کہے گا کہ خلافت کے لیے عمر فاروق کا انتخاب درست نہ تھا کیوں کہ ان کے مزاج میں بہت زیادہ شدت تھی۔ حالاں کہ یہ کرائٹیرین ہی اس معاملے میں بجائے خود درست نہیں۔

جیسا کام ہو ویسی ہی اہلیت درکار ہوتی ہے۔

اقدام کب

اسلامی شریعت کا ایک اہم اصول وہ ہے جس کو سدّ الذرائع کہا جاتا ہے۔ یعنی برائی پیدا ہونے والے اسباب کو روکنا۔ قرآن (الانعام ۱۰۸) کی ہدایت کے تحت علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ اگر حالات ایسے ہوں کہ ایک جائز کام کو کرنے سے ایک زیادہ بڑی برائی پیدا ہوتی ہو تو لازم ہے کہ مسلمان ایسے جائز کام سے باز رہیں:

إن المحقّ يكفُّ عن حقٍّ له إذا أدى إلى ضررٍ — حق دار اپنے حق سے رکا رہے گا جبکہ وہ ایک ضرر پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہو۔

(الجامع لاحکام القرآن ۷/۶۱)

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اقدام صرف اس بنا پر صحیح نہیں ہو جاتا کہ بظاہر وہ حق کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں یہ دیکھنا لازمی طور پر ضروری ہے کہ اقدام کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا۔ جو اقدام عملاً منفی نتیجہ ظاہر کرے۔ وہ ایک غیر مطلوب اقدام ہے، خواہ نظری طور پر وہ کتنا ہی زیادہ مطلوب نظر آتا ہو۔

ایک شخص اسلام کے خلاف گستاخی کرے، لیکن حالات کے اعتبار سے یہ اندیشہ ہو کہ اس کے خلاف کارروائی کرنا شدید تر برائی پیدا کرنے کا سبب بن جائے گا، تو ایسے موقع پر لازم ہوگا کہ گستاخی کے خلاف خاموشی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

ایک شخص آپ کو ایک چھوٹا نقصان پہنچائے، اور حالات بتاتے ہوں کہ اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زیادہ بڑی برائی کا سامنا پیش آجائے گا، تو ایسی حالت میں چھوٹی برائی کو برداشت کر لیا جائے گا تاکہ زیادہ بڑی برائی کو برداشت کرنے کی نوبت نہ آئے۔

ایک شخص علی الاعلان آپ کے خلاف ہنگامہ کھڑا کرے، اور حالات کے اعتبار سے یقینی نظر آتا ہو کہ اگر آپ نے جوابی کارروائی کی تو ہنگامہ بڑھ کر جان و مال کی تباہی تک پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں ضروری ہوگا کہ پرشور کارروائی کا جواب خاموش کارروائی کے ذریعے دیا جائے تاکہ نقصان کو اس کی ابتدائی حد پر روکا جا سکے ——— یہ اسلام کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔ اسلامی عمل وہی ہے جس میں اس حکمت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو۔

فرصت عمل

جب بھی زیادہ لوگ ساتھ مل کر زندگی گزاریں گے تو ان کے درمیان شکایت اور اختلاف کے واقعات بھی ضرور پیدا ہوں گے۔ ایسا ایک گھر کے اندر ہوگا، سماج کے اندر ہوگا، پورے ملک میں ہوگا، اور اسی طرح بین اقوامی زندگی میں بھی ہوگا۔ انسان خواہ جس سطح پر بھی ایک دوسرے سے ملیں اور تعلقات قائم کریں، ان کے درمیان ناخوش گوار واقعات کا پیش آنا بالکل لازمی ہے۔

ایسی حالت میں کیا کیا جائے، ٹالرنس اسی سوال کا جواب ہے۔ ایسی حالت میں ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ رواداری اور برداشت کا معاملہ کرے۔ مل جل کر زندگی گزارنے اور مل جل کر ترقی کرنے کی یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس اسپرٹ کے بغیر انسانی تمدن کی تعمیر اور اس کی ترقی ممکن نہیں۔

ٹالرنس کوئی انفعالی رویہ نہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے لیے زیادہ بہتر چوائس لینے کا موقع تھا اور اس نے کمتر چوائس کو اختیار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کے سوا کوئی اور چوائس ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ ٹالرنس ہماری ایک پریکٹیکل ضرورت ہے نہ کہ انفعالی پسپائی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک صورت حال کو اپنے لیے ناخوش گوار پا کر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری جدوجہد موجودہ صورت حال کو ہٹا کر دوسری زیادہ پسندیدہ صورت کو لانے کی جدوجہد ہے۔ مگر جب موجودہ صورت حال ختم ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صورت حال میں بھی دوبارہ اسی قسم کا ناخوش گوار پہلو موجود ہے جس کو برداشت نہ کرنے کی بنا پر وہ اس سے لڑ گیا تھا۔

ٹالرنس کا طریقہ ہم کو فرصت عمل دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہم ناموافق حالات سے ایڈجسٹ کر کے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھیں۔ اس کے برعکس اگر ہم ٹالرنس کو چھوڑ دیں اور جو چیز بھی ہم کو ناموافق نظر آئے اس سے لڑنے لگیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہم ایک چیز کو "برائی" کے نام سے ختم کریں گے، صرف اس لیے کہ اس کے بعد ایک اور شدید تر برائی میں اپنے کو مبتلا کر لیں۔

تغیر منکر

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : من رأى منكم منكراً فليغيره بيده (صحیح البخاری) یعنی تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔

اب ایک اور حدیث دیکھئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ قریش نے جب کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی تو انھوں نے اس کو ابراہیمی بنیاد سے گھٹا کر بنایا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ اس کو ابراہیمی بنیاد کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر قریش ابھی نئے نئے مسلمان نہ ہوئے ہوتے تو میں ایسا کر دیتا (فتح الباری ۳/۵۱۳)

ان دونوں حدیثوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تغیر منکر کا حکم مطلق معنوں میں نہیں ہے بلکہ وہ ایک مقید حکم ہے۔ اگر وہ کوئی مطلق حکم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایسا کرتے کہ مشرکین مکہ نے کعبہ کی تعمیر ثانی میں جو تبدیلی کی تھی اس کو ختم کر کے دوبارہ اس کو حضرت ابراہیمؑ کی ابتدائی اساس پر کھڑا کرتے۔

اس تقابلی مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تغیر منکر میں صرف "استطاعت" ہی کی شرط نہیں ہے بلکہ حکمت کی شرط بھی ہے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے حکمراں ہو چکے تھے۔ آپؐ کو یہ استطاعت حاصل ہو چکی تھی کہ آپؐ کعبہ کو ڈھا کر اسے ابراہیمی بنیاد پر تعمیر کر دیں۔ مگر آپؐ نے استطاعت کے باوجود ایسا نہیں کیا، کیوں کہ، حدیث کے الفاظ میں، ایسا کرنا حکمت کے خلاف ہوتا۔

تغیر منکر کے حکم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی جب کسی منکر کو دیکھے تو فوراً اس کے خلاف اقدام شروع کر دے۔ اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام صرف برائی کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ حالات کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ مومن پر لازم ہے کہ جب وہ کسی منکر کو دیکھے تو اس کے خلاف اقدام سے پہلے یہ سوچے کہ میرے اندر اس کی حقیقی استطاعت ہے یا نہیں، اور اگر بظاہر استطاعت ہو تب بھی ایسا کرنا حکمت کے مطابق ہے یا نہیں۔ استطاعت اور حکمت کی دوگونہ شرط کا لحاظ کیے بغیر تغیر منکر کے لیے اٹھنا فساد ہے نہ کہ اسلامی حکم کی تعمیل۔

دو قسمی طرزِ فکر

بلیسویں صدی کے نصف اول میں کمیونسٹ دنیا کا عام طرزِ فکر یہ تھا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے۔ اس طرزِ فکر کو نفسیات کی اصطلاح میں دو قسمی طرزِ فکر (dichotomous thinking) کہا جاتا ہے۔ یہ طرزِ فکر ہلاکت خیزی کی حد تک غلط ہے۔ چنانچہ تقریباً پچاس سال تک تمام کمیونسٹ اس حماقت میں مبتلا رہے کہ جہاں انھیں اقتدار حاصل تھا وہاں وہ ہر غیر ساتھی کو تہہ تیغ کرتے رہے۔ سابق سوویت یونین میں انھوں نے ۲۵ ملین انسانوں کو ذبح کر ڈالا اور بے شمار خاندانوں کی زندگیاں تباہ کر دیں۔

اس کے علاوہ جن ملکوں میں انھیں اقتدار حاصل نہ تھا وہاں انھوں نے اپنے غیر ساتھیوں کے خلاف لامتناہی قسم کی لفظی جنگ چھیڑ دی۔ تمام غیر ساتھیوں پر جھوٹی تنقیدیں کرنا، ان کی کردار کشی کرنا، ان کے خلاف جھوٹا لٹریچر چھاپنا، ان کے خلاف ہر الزام کو اپنا حق سمجھ لینا، یہ ان کا شیوہ بن گیا۔ اس راہ میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیت اور بہترین اثاثہ کو ضائع کر دیا۔

یہ طرزِ فکر سراسر غیر فطری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کی سوچ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آج وہ ایک ڈھنگ پر سوچتا ہے اور کل وہ دوسرے ڈھنگ پر سوچنے لگتا ہے۔ معلومات میں اضافہ اور نئے دلائل سے واقفیت، اس طرح کے اسباب آدمی کے ذہن کو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کوئی جامد اسٹیچو نہیں ہے۔ وہ ایک زندہ ہستی ہے۔ وہ بار بار خارجی اثرات کو قبول کرتا ہے۔

کوئی انسان یا کوئی گروہ اگر بظاہر آپ کا مخالف نظر آئے تو آپ اس کو مستقل طور پر اپنا مخالف نہ سمجھ لیجئے بلکہ اس کی مخالفت کو کم علمی یا غلط فہمی پر محمول کیجئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بارے میں آپ کے اندر ہمدردی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ آپ اس سے دور ہونے کے بجائے اس سے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ اس کے معاملے پر غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد، قرآن کے الفاظ میں، آپ دیکھیں گے کہ جو شخص بظاہر آپ کا دشمن نظر آتا تھا وہ آپ کا قریبی دوست بن گیا (فاذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولی حمیم)

فطرت کا نظام

کامیابی نام ہے خدا کے مقرر کیے ہوئے فطری نظام سے مطابقت کرنے کا ـــــــ یہی ایک لفظ میں زندگی کا راز ہے۔ خواہ وہ فرد کی زندگی کا معاملہ ہو یا سماج اور ریاست کا معاملہ۔

یہ دنیا جس میں ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں وہ ہم نے خود نہیں بنائی ہے۔ اور نہ اس کو بنانے والے نے ہمارے مشورہ کے مطابق اس کو بنایا ہے۔ یہ دنیا کچھ محکم اصولوں پر بنائی گئی ہے۔ اور وہ انہی اصولوں کے تحت چل رہی ہے، اور اسی طرح وہ ہمیشہ چلتی رہے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہماری حیثیت ثانوی ہے۔ ہمیں یک طرفہ طور پر دنیا کے نظام سے موافقت کرنا ہے۔ موافقت نہ کرنے کی صورت میں، نقصان اٹھانے والا فریق ہم خود ہوں گے نہ کہ بقیہ دنیا۔

ایک کسان اپنے کھیت سے اسی وقت ہری بھری فصل حاصل کرتا ہے جب کہ وہ فطرت کے مقرر کیے ہوئے قانون زراعت کی کامل پابندی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک انجینیر اسی وقت کوئی ٹکنیکل کارنامہ انجام دیتا ہے جب کہ وہ فزکس اور کیمسٹری کے قوانین فطرت کو پوری طرح استعمال کرے۔ وغیرہ۔

ٹھیک یہی معاملہ انسانی دنیا کا ہے۔ انسانی دنیا کے لیے بھی اسی طرح فطرت کے مقرر قوانین ہیں۔ یہاں بھی کوئی کامیابی صرف اس فرد یا قوم کے لیے مقدر ہے جو ان اصولوں کی پابندی کرے، جو فطرت نے پیشگی طور پر اس کے لیے قائم کر دیا ہے۔ کوئی بھی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ فطرت کے قانون کو نظر انداز کر کے اس دنیا میں اپنے لیے ایک کامیاب زندگی کی تشکیل کر سکے۔ فطرت کے نقشہ میں جو چیز محنت سے ملتی ہو اس کو ہم رعایت کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے، جو چیز صبر کا ثبوت دے کر ملتی ہو اس کو ہم عاجلانہ اقدام کے ذریعہ نہیں پا سکتے۔ جس چیز کا ملنا امن کی طاقت کے ساتھ مقدر کیا گیا ہے اس کو ہم تشدد کی طاقت کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ جو چیز تدریج کے ذریعہ ملنے والی ہو اس کو ہم چھلانگ کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔

کائناتی کلچر

میل ملاپ کوئی سادہ بات نہیں۔ وہ ہر قسم کی انسانی ترقی کا زینہ ہے۔ جس سماج میں لوگوں کے درمیان ملنا جلنا نہ ہو وہاں ہر ایک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ کوئی بھی شخص یا گروہ زیادہ آگے بڑھنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔

میل ملاپ (interaction) فطرت کا قانون ہے۔ وہ ساری کائنات میں ہر طرف جاری ہے۔ درخت ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تو خدا نے ان کے درمیان ہوائیں چلادیں جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔ خلا کے ستارے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں، ان کا آپس میں جسمانی طور پر ملنا ممکن نہیں، خدا نے انھیں روشنی دے دی۔ چنانچہ وہ روشنی کے ذریعہ ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے جاری ہونے والے چشمے سمندر سے بہت دور تھے مگر خدا نے ان کے لیے بہاؤ کی صورت پیدا کر دی۔ اس طرح یہ چشمے دریاؤں میں بہتے ہوئے سمندر میں جا کر مل جاتے ہیں۔

میل ملاپ ایک یونیورسل کلچر (کائناتی طریقہ) ہے۔ یہی یونیورسل کلچر انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ جس طرح بقیہ کائنات کا نظام درست طور پر باہمی ہم آہنگی کے ذریعہ چل رہا ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی کا نظام بھی درست طور پر اس وقت چل سکتا ہے جب کہ انسان بھی اس کائناتی کلچر کو اختیار کرے (آل عمران ۸۳)

دو انسان یا زیادہ انسان جب باہم ملتے ہیں تو یہ پتھروں کا باہم ملنا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایسی مخلوق کا ملنا ہوتا ہے جس کے اندر دل اور دماغ والی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا آپس میں ملنا جلنا مختلف قسم کے عظیم فائدوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح باہمی محبت بڑھتی ہے۔ یہ عمل ذہنی ارتقاء میں مددگار بنتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے تجربات سے نئی نئی باتیں سیکھتے ہیں۔ ہر فرد انسانیت کے مجموعی خزانے میں حصہ دار بن جاتا ہے۔ میل ملاپ صرف ایک سماجی سلوک نہیں۔ وسیع تر معنیٰ میں، وہ زندگی کی ایک عظیم تر حکمت ہے۔

راستہ تنگ نہیں

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ سے طائف جارہے تھے۔ درمیان میں ایک پہاڑی راستہ ملا جو بظاہر تنگ تھا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کو تنگ راستہ کہا جاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ یہ آسان راستہ ہے (بل ھی الیسریٰ)

اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ صحیح ہے کہ بطور واقعہ یہ راستہ تنگ ہے۔ اگر ہم پھیل کر اس میں جانا چاہیں تو ہم نہیں جاسکیں گے لیکن ہم اس طرح اس کو آسان بنا سکتے ہیں کہ ہم سمٹ کر قطار کی صورت میں اس سے گزریں۔ ایسی صورت میں راستہ کی تنگی ہمارے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ نگاہ یہ ہے کہ تنگی کو بھی کشادگی کے روپ میں دیکھا جائے۔ تنگی میں بھی کشادگی کا راز دریافت کیا جائے۔ منفی باتوں میں بھی مثبت پہلو تلاش کر لیے جائیں۔

تنگی بذات خود تنگی ہے۔ راستہ کی چٹان ہر حال میں چٹان ہی رہتی ہے۔ جو فرق ہے وہ خود تنگی یا چٹان میں نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ جب کوئی تنگ راستہ سامنے آجائے یا چٹان حائل ہو تو اس وقت طریق عمل کیا اختیار کرنا چاہیے۔

ایک طریقہ براہ راست مقابلہ کا ہے اور دوسرا اعراض کا۔ براہ راست مقابلہ میں تنگی اور چٹان بدستور تنگی اور چٹان بنے رہتے ہیں مگر اعراض کا طریقہ ان کے وجود کو عملی طور پر غیر موثر بنا دیتا ہے۔

جب بھی ایسا ہو کہ آپ کے سفر میں کوئی رکاوٹ پیش آجائے تو اس سے ٹکرانے پر اپنا ذہن نہ لگائیے بلکہ یہ سوچئے کہ رکاوٹ کو نظر انداز کر کے آپ کون سا ایسا حل پا سکتے ہیں جس کے بعد رکاوٹ اپنی جگہ باقی رہتے ہوئے بھی آپ کے لیے ایک غیر موجود چیز بن جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر راستہ تنگ ہی ہوتا ہے۔ تنگی اور کشادگی دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ حقیقی چیز صرف ایک ہے اور وہ تدبیر ہے۔ اور تدبیر مکمل طور پر اور ہمیشہ مسافر کے بس میں ہوتی ہے۔

تھرڈ آپشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں ایک جنگ وہ پیش آئی جس کو جنگ موتہ کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ شام کی سرحد پر رومیوں اور ان کے حلیفوں کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔ اس کے آغاز ہی میں صحابہ کی ایک تعداد شہید ہوگئی۔ اس کے بعد لوگوں نے حضرت خالد بن الولید کو سردار بنایا۔ حضرت خالدؓ نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں کے درمیان تعداد کے اعتبار سے ناقابل عبور حد تک فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حکمت کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے اور مزید لڑے بغیر مدینہ واپس آگئے۔

اس وقت مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کرتی تھی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ مقابلہ کو چھوڑ کر پسپائی کا طریقہ اختیار کرنا ہے اور جب انتخاب مقابلہ اور پسپائی کی دو حالتوں کے درمیان ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ مقابلہ کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ پسپائی کا۔

یہ معاملہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے حضرت خالدؓ کے حق میں رائے دی۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ صرف دو حالتوں کے درمیان سوچ رہے ہو —— مقابلہ یا پسپائی۔ مگر یہاں ایک تیسری حالت بھی ہے اور وہ ہے بے فائدہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر مزید تیاری کے میدان میں واپس آجانا اور اپنے آپ کو اس قابل بنانا کہ آئندہ زیادہ موثر انداز میں فریق مخالف کے چیلنج کا جواب دیا جا سکے۔ اور خالد نے اسی تیسری حالت کا انتخاب کیا ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حالت میں لوگ سیاہ اور سفید کے درمیان سوچتے ہیں۔ وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ظاہری دو حالتوں کے علاوہ وہاں ایک تیسری حالت بھی موجود ہے جو زیادہ مفید اور موثر ہے۔ اس تیسری حالت کا نام تھرڈ آپشن ہے اور مذکورہ سنتِ رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ تھرڈ آپشن کا طریقہ عین اسلام کا طریقہ ہے —— پہلا اور دوسرا آپشن کھلے طور پر موجود ہوتا ہے اس لیے ہر شخص اس کو جان لیتا ہے۔ مگر تیسرا آپشن جو زیادہ بہتر آپشن ہے وہ ہمیشہ چھپا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس کو وہی سمجھتا ہے جو عقل والا ہے۔

کامیاب تجارت

صہیبؓ رومی ایک صحابی تھے۔ ہجرت کے موقع پر وہ مکہ سے مدینہ جانے لگے تو ان کے پاس کچھ سونے کا سکہ (دینار) تھا۔ وہ باہر نکلے تو مکہ کے کچھ نوجوان انھیں ملے۔ بات چیت کے بعد انھیں معاملہ کا اندازہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم تم کو سونا لے کر مدینہ نہیں جانے دیں گے۔ صہیب رومیؓ نے کہا کہ میں تم کو یہ سونا دے دوں تو کیا تم مجھ کو یہاں سے جانے دو گے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ صہیب رومی نے فوراً سونا نکال کر انھیں دے دیا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔

وہ مدینہ پہنچے تو سب سے پہلے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور مکہ میں پیش آنے والا یہ واقعہ آپ کو بتایا۔ آپ نے اس کو سن کر فرمایا کہ اے صہیبؓ، تمہاری تجارت کامیاب رہی۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی سے نزاع کی صورت پیدا ہو جائے اور کچھ مادی نقصان اٹھا کر نزاع ختم ہو سکتی ہو تو مادی نقصان برداشت کرتے ہوئے فوراً نزاع کو ختم کر دیا جائے۔

یہ طریقہ بظاہر نقصان کا طریقہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ زبردست نفع کا طریقہ ہے۔ اس میں آدمی تھوڑی چیز دے کر زیادہ بڑی چیز پالیتا ہے۔

مذکورہ واقعہ میں ایک طرف چند دینار تھے اور دوسری طرف ایک انسان کا اپنا وجود۔ انسان کا اپنا وجود بہرحال چند دینار سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے چند دینار دے کر اگر ایک انسان کی زندگی محفوظ ہو جائے تو یہ نفع کی تجارت ہے نہ کہ گھاٹے کی تجارت۔

نزاع کو جاری رکھنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پیش قدمی کا عمل رک جاتا ہے۔ اور اگر نزاع کو ختم کر دیا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ پیش قدمی کا عمل جاری رہے گا۔ اور پیش قدمی کا جاری رہنا اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر ہے کہ ایک نزاع کی خاطر پیش قدمی کا عمل روک دیا جائے۔

انتظار کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو غزوات پیش آئے ان میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوۂ خندق کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر عرب کے قبائل بڑی تعداد میں اکٹھا ہو کر مدینہ آئے۔ انھوں نے چاہا کہ مدینہ پر حملہ کر کے اس کو تباہ کر دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ مخالف قبائل بڑی تعداد میں مدینہ کی طرف آرہے ہیں تو آپ نے فوراً یہ تدبیر کی کہ مدینہ کے اطراف میں خندق کھودنا شروع کر دیا۔ قبائل کا لشکر جب مدینہ کے پاس پہنچا تو یہاں خندق کھدی ہوئی تھی۔ وہ لوگ آسانی سے خندق کو پار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خندق کے دوسری طرف پڑاؤ ڈال دیا۔

وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ساتھیوں کو باہر سے للکارتے رہے۔ مگر آپ ان سے جنگ کے لیے نہیں نکلے۔ آپ اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ خندق کے دوسری طرف محفوظ طور پر رہ کر آنے والے وقت کا انتظار کرتے رہے۔

اس طرح تقریباً تین ہفتے گزر گئے۔ آخر کار فطرت کی طاقتیں حرکت میں آئیں۔ ایک دن زبردست آندھی چلی۔ مخالف لشکر کے خیمے اکھڑ گئے۔ ان کے کھانے کی دیگیں اڑ کر دور جا گریں۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ چنانچہ مخالفین کا لشکر گھبرا کر واپس چلا گیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی پالیسیوں میں سے ایک پالیسی یہ ہے کہ کوئی ناموافق صورت حال پیش آئے تو فوری اقدام نہ کیا جائے بلکہ انتظار کی پالیسی اختیار کی جائے۔ عین ممکن ہے کہ انتظار خود ایک حل بن جائے اور آئندہ ایسے حالات پیش آئیں کہ اقدام کے بغیر مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے۔

فطرت کا نظام ایک خدائی نظام ہے۔ فطرت کے نظام کی صورت میں کائنات خود ہر آن فساد کو اصلاح کی صورت میں بدلنے کے لیے سرگرم ہے۔ انسان اگر صبر کی روش اختیار کرے اور ناخوش گوار مواقع پر انتظار کی پالیسی پر قائم رہے تو وہ دیکھے گا کہ فطرت کی طاقتوں نے متحرک ہو کر اس کا وہ کام زیادہ بہتر طور پر انجام دے دیا ہے جس کو وہ اپنے کمتر وسائل کے ذریعہ صرف ناقص طور پر انجام دینا چاہتا تھا۔

میانہ روی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ وہ آدمی تنگ دست نہیں ہوگا جو اعتدال کا طریقہ اختیار کرے (ماعال من اقتصد) تفسیر عثمانی، صفحہ ۳۶۹

اپنی آمدنی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بقدر ضرورت خرچ کرنا اعتدال ہے۔ اور جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ آمدنی کی پروا کیے بغیر ہر چیز کے لیے خرچ کرتا رہے، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری تو ایسا شخص بے اعتدالی کے ساتھ خرچ کرنے والا انسان ہے۔ جو آدمی خرچ کے معاملہ میں اعتدال کی روش اختیار کرے وہ ہمیشہ خوش حال رہے گا۔ اور جو آدمی بے اعتدالی میں مبتلا ہو جائے اس کو کوئی چیز تنگ دستی اور محتاجی سے بچانے والی نہیں۔

اس اصول کا تعلق صرف مالیاتی معنوں میں آمد اور خرچ سے نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ آمد و خرچ کی طرح دوسرے معاملات میں بھی ایک اعتدال کا طریقہ ہے اور دوسرا بے اعتدالی کا طریقہ۔ اور اس دنیا میں کامیابی صرف اس کو ملتی ہے جو بے اعتدالی سے بچتے ہوئے اعتدال کی روش اختیار کرے۔

کسی سے آپ کی دوستی ہو تو ضروری ہے کہ آپ دوستی کو اعتدال کے دائرہ میں رکھیں۔ اگر آپ نے اس کا لحاظ نہیں کیا تو عین ممکن ہے کہ آپ کی دوستی آخر کار پشیمانی کا سبب بن جائے۔ اسی طرح کسی سے آپ کا اختلاف ہو جائے تو ضروری ہے کہ آپ اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھیں، اس کو نفرت اور دشمنی کی حد تک نہ لے جائیں۔ اختلاف اگر اختلاف کے دائرہ میں ہو تو وہ کسی وقت ختم ہو سکتا ہے لیکن جب وہ بڑھ کر نفرت اور دشمنی بن جائے تو اس وقت اس کا ختم ہونا انتہائی حد تک دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے جدوجہد کرنا پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی ضروری ہے کہ آدمی اعتدال کا انداز اختیار کرے، وہ جب بھی کوئی اقدام کرے تو احتیاط کے ساتھ اقدام کرے، وہ جب بھی کوئی منصوبہ بنائے تو خواہش کے بجائے حقیقت پسندی کی رہنمائی میں بنائے، وہ جلد نتیجہ دیکھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ تدریج کے اصول کے مطابق اپنے کام کو آگے بڑھائے۔

اعتدال کا طریقہ کامیابی کا طریقہ ہے اور بے اعتدالی کا طریقہ ناکامی کا طریقہ۔

اسٹیٹس کوازم

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے ـــــ اسٹیٹس کو پر راضی ہونا۔ یعنی نزاعی معاملات میں حالت موجودہ کو مان لینا، حالت موجودہ پر راضی رہتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرنا۔ نزاعی معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ ایک خاص مقام پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ ایک طرف فریق اول ہوتا ہے اور دوسری طرف فریق ثانی۔ نزاعی لائن کو پار کرنا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ حالات بتا رہے ہوتے ہیں کہ اگر اسٹیٹس کو (حالات موجودہ) کو بدلنے کی کوشش کی گئی تو دونوں کے درمیان سخت ٹکراؤ ہوگا۔ اور اس کے نتیجہ میں شدید تر برائی سامنے آجائے گی۔ ایسی حالت میں دانش مندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مقام نزاع پر جو صورت عملاً بن گئی ہے اس کو ویسا کا ویسا باقی رکھا جائے اور اپنی کوششوں کو دوسرے مقامات عمل کی طرف موڑ دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر جب عمرہ کی ادائیگی پر اصرار نہیں کیا اور وہیں سے مدینہ لوٹ آئے تو یہ وقتی طور پر اسٹیٹس کو کو مان لینے کا واقعہ تھا۔ بعض دوسرے واقعات ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مستقل طور پر اسٹیٹس کو پر راضی ہو گئے۔ اس کی نمایاں مثال کعبہ کو بنائے مشرکین پر باقی رکھنا، اور اس کو دوبارہ بنائے ابراھیم پر تعمیر نہ کرنا ہے۔

یہ طریقہ نزاعی معاملات میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ آدمی کی طاقت کا ہر جز صرف تعمیری کام میں خرچ ہو۔

ایک آدمی اپنی سواری دوڑاتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سڑک بند ہو۔ تو وہ بند سڑک سے نہیں ٹکراتا بلکہ اپنی سواری کو موڑ کر دوسرے راستے سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ اسی حکمت کا نام اسٹیٹس کوازم ہے۔

حالتِ موجودہ کو مانتے ہی آدمی کو فوراً اپنے عمل کا آغاز مل جاتا ہے۔ اور اپنے عمل کے لیے صحیح نقطۂ آغاز کو پا لینے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو۔ تو جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے (النساء ۱۲۸)

صلح بہتر ہے (الصُّلح خیر) ایک عام فطری اصول ہے۔ اس کا تعلق گھر کے مسائل سے بھی ہے اور بین اقوامی سطح پر پیش آنے والے معاملات سے بھی ہے۔ جب بھی کسی فرد یا گروہ کو دوسرے فرد یا گروہ کی طرف سے کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے تو ایسے موقع پر عقل مندی یہ ہے کہ اس کے جواب میں ردعمل کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ ایسے مواقع پر بہتر طریقہ صلح کا ہے نہ کہ نزاع کا۔

نزاعی امور میں صلح کی پالیسی کوئی پسپائی یا بزدلی نہیں ہے۔ اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ اپنے وقت اور قوت کو بے فائدہ طور پر ضائع کرنے سے بچایا جائے اور اس کو مفید استعمال کی طرف موڑ دیا جائے۔

صلح کا الٹا رویہ جنگ ہے۔ جنگ یا ٹکراؤ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں دو فریقوں کے درمیان نزاع کی صورت پیش آئی ہے، دونوں فریق بس وہیں ٹھہر جائیں۔ وہ اپنے سفر کو مقام نزاع پر روک دیں۔ اس کے برعکس ایسے معاملات میں صلح کی پالیسی اختیار کرنا آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے سفر کو روکے بغیر مسلسل اسے جاری رکھے۔ وہ کسی وقفے کے بغیر چلتا رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل کو پہنچ جائے۔

صلح کا طریقہ وقتی طور پر کھونے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر حال سے نظریں ہٹا کر آنے والے مستقبل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ مکمل طور پر پانے کا طریقہ ہے۔ آخری نتیجے کے اعتبار سے صلح کی پالیسی ہمیشہ کامیابی کا سبب بنتی ہے، اور ٹکراؤ کی پالیسی ہمیشہ تباہی اور ناکامی کا سبب۔

درمیانی طریقہ

قرآن میں ہے کہ چلنے میں درمیانی چال اختیار کرو (لقمان) حدیث میں ہے کہ معاملات میں سب سے بہتر طریقہ درمیانی طریقہ ہے (خیر الامور اوسطها)

درمیانی طریقہ اختیار کرنا اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر معاملہ میں ہمیشہ ایسا کیا ہے۔ نمازوں میں آپ اکثر درمیانی سورتیں پڑھتے تھے، نہ زیادہ بڑی اور نہ زیادہ چھوٹی۔ اسی طرح تمام عبادات میں آپ ہمیشہ درمیانی انداز اختیار کرتے تھے۔

گفتگو میں آپ نہ بہت زیادہ مختصر بولتے اور نہ بہت لمبا کلام کرتے۔ بلکہ آپ کا طریقہ دونوں کے درمیان تھا۔ کھانے پینے کے معاملہ میں آپ نہ بہت زیادہ شکم سیر ہو کر کھاتے اور نہ فاقہ کشی کی مشقت اختیار کرتے۔ بلکہ ہلکی خوراک آپ کا طریقہ تھا۔

آپؐ نے فرمایا کہ کسی سے دوستی کرو تو دوستی میں حد سے نہ گزر جاؤ۔ اسی طرح اگر کسی سے دشمنی ہو جائے تو دشمنی میں بھی ایک حد پر قائم رہو۔ صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہم کو تکلف اور غلو سے منع فرمایا ہے۔ اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر قسم کے انسانی تعلقات میں اعتدال اور توسط کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ خاندانی زندگی، سماجی تعلقات اور ملّی روابط ہر جگہ یہی مطلوب ہے کہ ہمیشہ درمیانی انداز اختیار کیا جائے۔

اپنے کمائے ہوئے مال کو خرچ کرنے کے معاملہ میں اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرو۔ نہ تو بالکل بخیل بن جاؤ اور نہ بہت زیادہ فیاض۔ کمانے کے معاملہ میں بھی آدمی کو اعتدال کا انداز اختیار کرنا چاہیے اور اسی طرح اس کو چاہیے کہ وہ جو مال کمائے اس کو اعتدال کے ساتھ ضروری مدوں میں خرچ کرے۔

اسی طرح وہ تعلقات جن کو بین اقوامی تعلقات کہا جاتا ہے اس کے بارے میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا مطلوب ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سرحدی قوتوں کے ساتھ ہمیشہ نارمل تعلق کو برقرار رکھا جائے۔ ہمیشہ یہ کوشش کی جائے کہ ان کے ساتھ تعلق اعتدال کے دائرہ میں رہے، اعتدال کی حد سے باہر نہ جانے پائے۔

چھوٹے شر کا انتخاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں ایک سنگین مسئلہ وہ تھا جس کو عبد اللہ بن ابی کی صورت میں جانا جاتا ہے۔ وہ قبیلہ خزرج کا بڑا سردار تھا۔ اسلام کے خلاف وہ اتنا زیادہ بڑا مسئلہ تھا کہ خود اس کا مسلمان بیٹا عبد اللہ اس کے قتل کے لیے تیار ہو گیا تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل نہیں کروایا۔ یہاں تک کہ وہ ۹ھ (۶۳۰ء) میں اپنی طبعی موت مرا۔

عبد اللہ بن ابی کے معاملہ میں صبر و برداشت کی اس غیر معمولی پالیسی کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ عبد اللہ بن ابی کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں تھا۔ اس وقت کی صورت حال بتا رہی تھی کہ یہ صرف زندہ عبد اللہ اور مردہ عبد اللہ کے درمیان انتخاب کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں ایک تیسری شدید تر صورت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اس کو قتل کروایا گیا تو یقینی طور پر قبائلی عصبیت جاگ اٹھے گی۔ بہت سے لوگ اس کے خون کا انتقام لینے کے درپے ہو جائیں گے۔ اس طرح عبد اللہ بن ابی کو قتل کر کے عملاً اس کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ ایک اور شدید تر برائی جاگ اٹھے گی۔ اور وہ اپنے مقتول سردار کا انتقام ہے۔ اس اندیشہ کی پیشگی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ تھی کہ غزوۂ احد کے موقع پر اس نے جنگ میں عدم شرکت کا فیصلہ کیا تو اس کے قبیلہ کے تین سو آدمیوں نے عبد اللہ بن ابی کے ساتھ شریک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی کے معاملہ میں اس وقت جو انتخاب تھا وہ زندہ دشمن اور مردہ دشمن کے درمیان نہیں تھا بلکہ وہ مردہ دشمن اور اس کے بعد ظاہر ہونے والے انتقامی ردعمل کے درمیان تھا۔ ایسی حالت میں زندہ دشمن چھوٹا شر تھا اور مردہ دشمن انتقامی ردعمل کی صورت میں زیادہ بڑا شر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو گوارا کر لیا۔

زندگی خیر و شر کے درمیان انتخاب کا نام نہیں۔ زندگی چھوٹے شر اور بڑے شر کے درمیان انتخاب کا نام ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اس حقیقت کو جان لے۔

مینیم سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی وفات ۶۳۲ء میں مدینہ میں ہوئی۔ پہلی وحی آپ پر ۶۱۰ء میں نازل ہوئی۔

اس وقت مکہ میں بہت سے نہایت سنگین قسم کے مسائل تھے۔ مثلاً مقدس کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اجتماعی معاملات کے فیصلہ کا مرکز دار الندوہ مشرکوں کے قبضہ میں تھا۔ معاشرہ میں بدکاری، شراب، جوا جیسے سخت جرائم پھیلے ہوئے تھے۔ ایرانی ایمپائر اور رومی ایمپائر نے عربوں کو اپنے ماتحت کا درجہ دے رکھا تھا۔ وغیرہ۔

مگر آپؐ پر جو پہلی وحی اتری اور جس میں حکم دیا گیا کہ آپ ان حالات میں کیا کریں۔ اس میں ان مسائل میں سے کسی مسئلہ کا ذکر نہیں تھا۔ اور ان کے بارہ میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ آپؐ سے سادہ طور پر صرف یہ کہا گیا: اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاكرم الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم يعلم۔

اس وقت کے مسائل کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ کم سے کم (minimum) کا حکم تھا۔ مذکورہ مسائل کے بارے میں اگر آپ کو حکم دیا جاتا اور آپ اس کے لیے عمل شروع کر دیتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فوراً گرد و پیش کے لوگوں سے آپ کا شدید ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔

مینیم سے آغاز کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب کہ زیادہ سے آغاز کا نتیجہ اکثر حالات میں الٹا برآمد ہوتا ہے۔

کسی بھی معاملے میں کامیاب ہونے کی شرط یہ ہے کہ صحیح مقام سے اُس کا آغاز کیا گیا ہو۔ اور صحیح آغاز وہی ہے جو ممکن ہو۔ ممکن سے آغاز ہی در اصل صحیح آغاز ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مینیم ہمیشہ ممکن ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں میکسیم سے آغاز ہمیشہ ناممکن اور ناقابل عمل۔

مینیم سے آغاز کا مطلب کم سے آغاز نہیں ہے بلکہ ممکن سے آغاز ہے۔ اسی طرح میکسیم سے آغاز کا مطلب زیادہ سے آغاز نہیں ہے بلکہ ناممکن سے آغاز ہے۔

حکمتِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری زمانہ میں مدینہ سے مکہ جاکر حج کیا۔ اس موقع پر آپ نے وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں، سوا دین اور تقویٰ کے۔ اس طرح آپ نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق کے قدیم رواج کا خاتمہ کر دیا۔

مگر اسی کے ساتھ آپ نے دوسرے موقع پر یہ بھی فرمایا کہ: الائمۃ من قریش یعنی میرے بعد مسلمانوں کا سیاسی امام قریش میں سے ہوگا۔ یہ دوسرا بیان بظاہر پہلے بیان کے مطابق نہیں مگر یہ عدم مطابقت کی بات نہیں بلکہ عملی تقاضوں کی رعایت کرنے کی بات ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تنہا نماز میں اتنا لمبا قیام فرمایا کہ آپ کے پاؤں میں سوجن آگئی۔ دوسری طرف جماعت کی نماز پڑھاتے ہوئے صف کے پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تو آپ نے مختصر سورۃ پڑھاکر نماز جلد ختم کر دی۔ اس فرق سے مذکورہ معاملہ کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاملہ تنہا اپنی ذات کا ہو تو مومن کو چاہیے کہ وہ آئیڈیل کو اختیار کرنے کی کوشش کرے مگر جب اجتماعی معاملہ ہو اور دوسروں کے ساتھ نباہ کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت وہ پریکٹیکل بن جائے۔ اس دوسری صورت میں حالات کے اعتبار سے عملی تقاضوں کی رعایت کی جائے گی۔ کیوں کہ صرف وہی قابلِ عمل ہے۔ ایسے معاملات میں آئیڈیل کو چلانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کی ایک سنت یہ ہے کہ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے صرف یہ نہ دیکھا جائے کہ آئیڈیل نقطۂ نظر کیا ہے یا معیاری انصاف کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ جن لوگوں کے ساتھ معاملہ پیش آیا ہے وہ کس درجہ کے لوگ ہیں اور حقیقی حالات کا تقاضا کیا ہے۔ اس طرح کا جائزہ لے کر حقیقی صورتِ حال کے مطابق وہ مسلک اختیار کیا جائے جو عملی طور پر ممکن ہو نہ کہ وہ مسلک جو بظاہر نظریاتی طور پر درست ہو مگر عملی طور پر اس کو اختیار کرنا ممکن نہ ہو۔

حکمتِ حیات

صلح اپنا حق وصول کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ صلح فریق ثانی کے شر سے بچنے کے لیے ہوتی ہے۔ فریق ثانی اگر عادل ہو تو کسی صلح کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ صلح کے بغیر ہی آپ کو آپ کا پورا حق دے دے گا۔ مگر جب فریق ثانی غیر عادل ہو تو وہ آپ کو الجھا کر آپ کو اپنی تعمیر کے راستہ سے ہٹا دینا چاہے گا۔ اس وقت خدا پرست آدمی اپنے حریف سے خود اس کی شرائط پر صلح کر لیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے دامن کو بے فائدہ الجھاؤ سے بچالے اور اپنے تعمیری عمل میں مصروف ہو جائے۔

جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ صلح کے وقت اپنے حقوق کی فہرست بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور اصرار کرنے لگتے ہیں کہ ان کے جائز حقوق انھیں لوٹائے جائیں۔ اس قسم کی کوشش صلح کی راہ میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اس طرح کی کوشش صرف معاملہ کو الجھاتی ہے وہ صلح کو تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتی۔

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ وہ غیر عادل انسانوں سے اس طرح بھری ہوئی ہے جس طرح کوئی کانٹے دار درخت کانٹوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی دنیا میں آدمی کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ غیر عادل انسانوں سے معاملاتی الجھاؤ کی نوبت نہ آنے دے۔ ان سے دور کا تعلق رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا راستہ طے کرتا رہے۔

لیکن اگر کبھی کسی وجہ سے کسی غیر عادل انسان سے معاملاتی نزاع پیدا ہو جائے تو پہلی فرصت میں اس سے صلح کر کے آگے بڑھ جانا چاہیے۔ آدمی کی ساری توجہ سفر کو دوبارہ بلا رکاوٹ جاری کرنے سے ہونی چاہیے نہ کہ فریق ثانی سے اپنے حقوق کی وصولیابی پر۔

یہ صلح کوئی پسپائی نہیں، یہ بامقصد انسان کا اصول ہے۔ جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو وہی ایسا کر سکتا ہے کہ وہ صلح کو حقوق کی وصولیابی کا عنوان بنائے اور پھر اس ناقابل عمل صلح کے لیے ساری عمر لڑتا رہے ——— اسلام میں صلح کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ صلح کو ہر حال میں خیر بتایا گیا۔ حتیٰ کہ حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفین سے اُن کی یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔

خدائی نظام

وما اصابکم من مصیبۃٍ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر۔ (الشوریٰ ۳۰)

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے۔ اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی جب بھی دنیا میں کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی دوسرے کی زیادتی کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ جب ہر آدمی خود اپنے کیے کو بھگت رہا ہو تو دوسرے کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام ہے اور اس نظام میں ہمارے لیے خوش خبری ہے۔ وہ ہمارے لیے عظیم الشان امید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قدرتی نظام نے ہمارے مسائل کے حل کو خود ہمارے اپنے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم کو اس کا محتاج نہیں کیا کہ ہم کسی دوسرے کی مہربانی کا انتظار کریں۔

کوئی آدمی جن مسائل سے دوچار ہو اگر اس کا سبب کچھ دوسرے لوگ ہوتے تو گویا کہ ہم دوسروں کے اوپر منحصر ہوتے۔ ہمیں دوسروں کی عنایت کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ یہاں ہر آدمی کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں رکھ دیا۔ یعنی ہر آدمی اپنی ہی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ہر آدمی کا مستقبل خود اس کے اپنے اختیار میں ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نادانی کی بنا پر نقصان اٹھاتا ہے، ایسے لوگ دوبارہ دانش مندی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ کبھی کسی کا معاملہ غیر منصوبہ بند انداز میں کام کرنے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اس کے لیے موقع ہے کہ آئندہ وہ منصوبہ بند انداز میں کام کر کے از سر نو اپنے معاملہ کو درست کر لے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش کو اپنا کر آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے، اب اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ صبر کی روش کو اپنا کر دوبارہ اپنے آپ کو مصیبتوں سے بچا لے۔ کبھی کچھ لوگ جذباتی اقدام کر کے اپنے کو بربادی میں ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے موقع ہے کہ وہ حقیقت پسندی کے اصول پر چل کر دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

مشکل میں آسانی

مکی دور میں جب کہ مسلمان نہایت سخت حالات سے گزر رہے تھے، اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، مشکل کے ساتھ آسانی ہے (الانشراح) اس قرآنی آیت میں فطرت کا یہ قانون بتایا گیا کہ اس دنیا میں ہمیشہ مشکلات کے ساتھ مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے بہترین عقل مندی یہ ہے کہ مشکلات سے صرف نظر کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے اس طرح زیادہ بہتر طور پر مستقبل کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔

عام طور پر دنیا میں لوگ ایک ہی عمل کو جانتے ہیں، اور وہ ہے مشکلات سے لڑ کر انھیں راستہ سے ہٹانا اور اس طرح اپنے لیے راہ ہموار کرنا، مگر اسلامک ایکٹوزم یہ نہیں ہے۔ اسلامک ایکٹوزم اس کے برعکس ہوتا ہے کہ مشکلات سے ٹکرانے کے بجائے انھیں نظر انداز کرو، اور عین اسی وقت جو مواقع موجود ہیں ان کو استعمال کرو۔ گویا اسلامک ایکٹوزم ایک لفظ میں یہ ہے کہ مشکلات کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

مشکلات و مسائل کو موجودہ دنیا سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مشکلات و مسائل کا وجود اس دنیا میں اتنا ہی حتمی ہے جتنا کہ پھول کے درخت میں کانٹا۔ اس لیے مشکلات و مسائل سے ٹکرانا فطرت کی اٹل حقیقتوں سے ٹکرانا ہے۔ اور کون ہے جو فطرت کی حقیقتوں سے ٹکرا کر انھیں بدل سکے۔

عقل مند وہ ہے جو مشکلات و مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع اور امکانات کو تلاش کرے۔ زندگی کا کامیاب سفر ہمیشہ امکانی راہوں میں جاری ہوتا ہے نہ کہ مشکلات کی چٹانوں پر اپنا سر ٹکرانے سے۔ جس طرح درخت میں پھول اور کانٹا دونوں ہوتا ہے اسی طرح موجودہ دنیا مشکلات اور مواقع دونوں سے بھری ہوئی ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ مشکلات میں نہ الجھے۔ وہ مواقع کو دریافت کر کے انھیں استعمال کرے۔ وہ شکایت اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ کر صبر و تحمل کے ساتھ اپنا راستہ طے کرتا رہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آخر کار کامیاب ہوں گے۔ جو لوگ اس کے برعکس روش اختیار کریں ان کے لیے خدا کی دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

حکمت کی بات

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے، وہ جہاں اسے پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے (اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ اَیْنَ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا)

اس حدیثِ رسولؐ میں خدا پرست انسان کا مزاج بتایا گیا ہے۔ خدا پرست انسان ہر قسم کے تعصب سے پاک ہوتا ہے، وہ اپنے اور غیر میں فرق نہیں کرتا۔ وہ تمام دنیا کو خدا کی مخلوق کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتا ہے۔ خدا پرست انسان کا یہ مزاج اس کو آفاقی بنا دیتا ہے۔

ایسا انسان ہر چیز سے سبق لینے لگتا ہے، وہ ہر کام کی بات کو اپنی بات سمجھتا ہے۔ اس کی آفاقی سوچ اُس کو اِس کمزوری سے بچا لیتی ہے کہ وہ کسی فائدہ کی بات کو دیکھے، تو اس کو غیر کی چیز سمجھ کر چھوڑ دے۔ وہ ہر اچھی بات کو خدا کی بات سمجھتا ہے، اس لیے وہ ہر اچھی بات کو اس طرح لے لیتا ہے جیسا کہ وہ اس کی اپنی ہی بات ہو۔

خدا پرست انسان کا یہ مزاج اس کو بے پناہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے ذہنی خزانہ میں نئی نئی باتوں کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کبھی ٹھہراؤ کا شکار نہیں ہوتی، وہ ہر موڑ پر ایسی باتیں پالیتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی زندگی کے سفر کو آگے کی طرف جاری رکھ سکے۔

دنیا میں کامیابی کا تعلق سب سے زیادہ جس چیز سے ہے وہ معلومات ہیں، جتنی زیادہ معلومات اتنی زیادہ کامیابی۔ خدا پرست انسان اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھتا ہے، اس بنا پر یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

خدا پرست انسان کا مزاج اس کو کامل طور پر علم کا طالب بنا دیتا ہے۔ نئی نئی باتوں سے اس کی روح کو غذا ملتی ہے۔ وہ درخت کی مانند ایک اضافہ پذیر وجود بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت مسلسل بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ تکمیل کی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے۔

مومن ایک بے تعصب انسان ہوتا ہے۔ وہ آخری حد تک طالب حق ہوتا ہے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی کوئی اچھی بات ملے وہ فوراً اس کو لے لے۔

عذر نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارہ میں اکثر لوگ دھوکہ میں رہتے ہیں —— صحت اور فرصت (نعمتان مغبون فیہما کثیرٌ من الناس : الصحۃ والفراغ) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۱ صفحہ ۲۳۳

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے یا کوئی کام کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ یہ دو چیزیں صحت اور فرصت ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بلاشبہہ اللہ کی عظیم نعمت ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے معاشی کاموں میں مشغول رہتا ہے اور اعلیٰ انسانی مقاصد کے لیے سرگرم نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ اعلیٰ انسانی مقاصد کے لیے جینے ہی کا نام انسانیت ہے۔ جو آدمی صرف معاش اور اقتصادیات کے لیے جئے، وہ گویا حیوان جیسی زندگی گزار رہا ہے۔

جب انسانی مقاصد کے لیے کام کرنے کا موقع آتا ہے تو بیشتر لوگ یہ سوچ کر اس کے لیے سرگرم نہیں ہو پاتے کہ جب صحت اور فرصت ملے گی تو اس کے لیے بھی کام کر لیں گے۔ حالانکہ زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ صحت اور فرصت دونوں معیاری صورت میں مل جائیں۔ بیشتر حالات میں یہی ہوتا ہے کہ اگر صحت ہے تو فرصت نہیں اور اگر فرصت ہے تو صحت نہیں۔ اعلیٰ مقاصد کے لیے صحت اور فرصت کی شرط لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کبھی کوئی اعلیٰ کام نہ کر سکے، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جائے۔

زندگی عذر سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ آدمی کے سامنے کبھی صحت کی خرابی کا عذر ہوتا ہے اور کبھی فرصت نہ ہونے کا عذر۔ دانش مندی یہ ہے کہ کسی بھی حال میں عذر کو عذر نہ بنایا جائے۔ عذر کو ناقابل لحاظ سمجھ کر اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔

زندگی میں کمیاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ وہ آدمی کو کمزور کریں، بلکہ وہ آدمی کے لیے طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ فطرت کا نظام ہے کہ کمی کا احساس آدمی کی ذہنی سرگرمیوں کو بڑھاتا ہے۔ کمی کا احساس معمولی آدمی کو غیر معمولی آدمی بنا دیتا ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ عذر کے باوجود کام کرنا سیکھے، عذر کے باوجود وہ اپنے عمل کو جاری رکھے۔ یہی لوگ ہیں جو موجودہ دنیا میں کامیابی اور ترقی کے اعلیٰ مقامات حاصل کرتے ہیں۔

قابل اعتماد کردار

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے تیرھویں سال مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ وہی سفر ہے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد نازک سفر تھا۔ مکہ کے سردار آپؐ کو مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے۔ آپ کو نہایت مخفی طور پر مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچنا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ جب آپ مکہ سے نکل کر مدینہ کے لیے روانہ ہوں گے تو مکہ کے سردار آپ کے پیچھے اپنے آدمی دوڑائیں گے، وہ ہر کوشش کریں گے کہ آپؐ کو دوبارہ پکڑ لیں۔

ان حالات میں مختلف قسم کی احتیاط ضروری تھی۔ مثلاً مکہ سے نکل کر الٹی طرف جانا، پہلے غار ثور میں قیام کرنا۔ ابتداءً پیدل سفر طے کرنا اور پھر راستہ میں اونٹ کی سواری اختیار کرنا، معلوم اور معروف راستہ کو چھوڑ کر غیر عادی راستہ کا سفر کرنا، وغیرہ۔ قدیم زمانہ میں جب کہ سڑکیں نہیں تھیں، اس طرح کا سفر ایک واقف کار رہنما کی مدد ہی سے ہو سکتا تھا، رہنما کے بغیر ایسا سفر طے کرنا ناممکن تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس سفر میں رہنمائی کے لیے مکہ کے ایک شخص کو منتخب کیا جس کا نام عبد اللہ بن ارقط تھا۔ یہ آدمی اس طرح کے لمبے سفروں میں بطور پیشہ رہنمائی کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ اگرچہ مشرک تھا، بالفاظ دیگر، اس کا تعلق آپ کی دشمن قوم سے تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس نازک سفر کے لیے اسی کا انتخاب فرمایا (سیرۃ ابن ہشام ۲ صفحہ ۹۸)

اس انتخاب کا سبب کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبد اللہ بن ارقط اگرچہ مخالف قوم سے تعلق رکھتا تھا مگر اس کے اندر وہ چیز کمال درجہ میں تھی جس کو پروفیشنل دیانت داری کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے کام کے بارے میں وہ پوری طرح مخلص تھا۔ وہ جس خدمت کی ذمہ داری کو قبول کرتا اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا تھا۔ کام کے معاملہ میں وہ نہ عقیدہ کو رکاوٹ بناتا اور نہ کسی ذاتی مفاد کو۔

پروفیشنل دیانت داری کی یہ صفت آدمی کو سب کی نظر میں قابل اعتماد بنا دیتی ہے، حتی کہ اس کے مخالفین بھی اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا قول لوگوں کی نظر میں چٹان کی طرح مضبوط بن جاتا ہے، وہ اپنے اور غیر سب کی نظر میں عزت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

علم کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنے دعوتی کام کا آغاز کیا۔ آپ کی دعوت مکمل طور پر ایک پرامن دعوت تھی مگر مکہ والوں نے آپ کے خلاف یک طرفہ طور پر تشدد شروع کر دیا۔ اس کے بعد آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ اب مدینہ آپؐ کی دعوت کا مرکز بن گیا۔ تاہم مکہ کے سردار اس پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے آپ کے خلاف مسلح جارحیت کی جس کے نتیجہ میں ۲ھ میں وہ لڑائی پیش آئی جو غزوۂ بدر کے نام سے مشہور ہے۔

اس جنگ میں خدا نے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی اور وہ اپنے مخالفین پر کامیاب ہوئے۔ اس جنگ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ اس میں مکہ کے ستر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے۔ یہ لوگ قدیم معیار کے مطابق پڑھے لکھے تھے۔ جب کہ مدینہ میں پڑھائی کا رواج نہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو ان قیدیوں کا فدیہ قرار دے دیا۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ ان میں سے جو آدمی مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا تو اس کو ہم قید سے رہائی دے دیں گے۔ چنانچہ کئی قیدیوں نے اس طرح تعلیمی خدمت انجام دے کر رہائی حاصل کی (سیرت ابن کثیر ۲ صفحہ ۵۱۲)

یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا مدرسہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مسلم نوجوانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا ایک نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسہ کے تمام کے تمام ٹیچر غیر مسلم تھے بلکہ وہ دشمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ اس واقعہ کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ —— ہر حال میں تعلیم حاصل کرو، خواہ تم کو اغیار سے تعلیم حاصل کرنا پڑے، خواہ تم کو ایک ایسے ادارہ میں پڑھنا پڑے جس کے تمام ٹیچر تمہاری دشمن قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ انسان پیدائشی طور پر ہر صلاحیت لے کر آتا ہے مگر ان صلاحیتوں کو صحیح طور پر عمل میں لانے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم آدمی کو باشعور بناتا ہے۔ علم آدمی کو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھاتا ہے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے واقفیت حاصل کرے۔ علم کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی کتابوں کی صورت میں پچھلے انسانوں کے تجربات پڑھے۔ وہ تاریخ کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے واقف ہو۔

علم کے بغیر آدمی محدود ہے۔ علم حکمت و معرفت کا خزانہ ہے۔

درست کلام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات (قول سدید) کہو، وہ تمہارے اعمال سدھارے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۱-۷۰)

سدید کے معنی وہی ہیں جس کو اردو میں درست یا ٹھیک کہتے ہیں۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے سَدَّدَ الرُّمْحَ، یعنی تیر کو ٹھیک نشانہ کے رخ پر سیدھا کیا۔ اس اعتبار سے قول سدید کے معنی ہوں گے بالکل ٹھیک بات، نشانہ پر لگتی ہوئی بات (ای قولاً قاصداً غیر جائر، حقاً غیر باطل (الطبری)) (ای مستقیما لا اعوجاج فیہ ولا انحراف (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ درست کلام سے اصلاح اعمال کا فائدہ ہوتا ہے۔ جس سماج میں لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ کسی بات کو درست انداز میں کہیں اس سماج کے معاملات بھی درست رہتے ہیں۔ درست بات اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ لوگوں کے معاملات بگڑنے سے بچ جائیں۔

مثلاً آپ اپنے عبادت خانہ کے اندر داخل ہوں۔ وہاں آپ دیکھیں کہ فرش پر مقدس کتاب کے کچھ اوراق بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ میں عبادت خانہ میں داخل ہوا تو وہاں مقدس کتاب کے کچھ اوراق بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ لوگوں کو یہ بتائیں کہ دوسرے فرقے کے لوگوں نے مقدس کتاب کی بے حرمتی کی، اور اس کے اوراق پھاڑ کر زمین پر پھینک دیے۔

آپ کی پہلی بات قول سدید کی مثال ہے۔ اور دوسری بات قول غیر سدید کی مثال۔ اگر آپ معاملے کو پہلی قسم کے الفاظ میں بیان کریں تو اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر آپ مذکورہ مثال کے مطابق، دوسری قسم کے الفاظ بولنے لگیں تو سننے والے بھڑک اٹھیں گے۔ ہر طرف غم و غصے کی لہر دوڑ جائے گی۔ لوگ دوسرے فرقے کے خلاف انتقامی کارروائی شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد جوابی انتقام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور پھر پوری بستی آگ اور خون کی نذر ہو جائے گی۔

منصوبہ بند عمل

قرآن کی سورہ نمبر۴۶ میں ارشاد ہوا ہے ــــ پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لهم) الاحقاف ۳۵

زندگی مشکلات اور مسائل کے درمیان جینے کا نام ہے۔ خاص طور پر جو آدمی کوئی مقصد یا مشن لے کر اٹھے اس کے لیے تو قدم قدم پر رکاوٹیں اور مخالفتیں پیش آتی ہیں۔ اس کو طوفانوں کے درمیان اپنا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں زندگی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی مخالف صورت حال سامنے آئے تو فوری ردعمل کے تحت اس کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مخالف صورت حال پیش آنے کے بعد آدمی اپنے جذبات کو تھامے۔ وہ پورے معاملہ پر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ غور و فکر کرے۔ اسی کے ساتھ وہ صاحب مشورہ لوگوں سے مشورہ بھی کرے۔ اس کے بعد سوچے سمجھے فیصلہ کے مطابق جوابی کارروائی کرے ــــ پہلے طریقہ کا نام عجلت ہے اور دوسرے طریقہ کا نام صبر۔

عجلت کے تحت کیا ہوا اقدام ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے اقدام میں صورت حال کا پورا جائزہ شامل نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی نہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ کرتا ہے اور نہ فریق ثانی کی طاقت کا۔ وہ نتیجہ کی پروا کیے بغیر فوری طور پر مقابلہ کے میدان میں کود پڑتا ہے۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اسباب کا لحاظ کیے بغیر اس دنیا میں جو اقدام کیا جائے وہ کبھی کامیابی کے درجہ تک نہ پہنچے۔

صبر کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جو آدمی صبر کا طریقہ اختیار کرے وہ کارروائی سے پہلے اس کے انجام کو سوچتا ہے، وہ جذبات کی رعایت کرنے کے بجائے حقیقت کی رعایت کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں فطرت کے قانون کی حکمرانی ہے، نہ کہ اس کی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی۔

صبر یہ ہے کہ آدمی جذبات سے اوپر اٹھ کر حقیقت کو دیکھے۔ وہ ذاتی خواہشوں سے غیر متاثر رہ کر فطرت کے نظام کو سمجھے۔ صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ منصوبہ بند عمل کر سکے اور اس دنیا میں کامیاب عمل وہی ہے جو منصوبہ بندی کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔

منفی سوچ نہیں

ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ اس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ یہ غزوہ ہر اعتبار سے مخالفین اسلام کی جارحیت اور زیادتی پر مبنی تھا۔ بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ قرآن میں اس پر مخالفین کے لیے مذمت کی آیتیں اتریں۔ مگر برعکس طور پر قرآن میں وہ آیتیں اتریں جن میں خود مسلمانوں کو نصیحت کی گئی تھی —— قرآن میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ اگر احد کے موقع پر تم کو زخم پہنچا ہے تو اس سے پہلے بدر کے موقع پر فریق ثانی کو زخم پہنچ چکا ہے۔ اور یہ ایام ہم اسی طرح بدلتے رہتے ہیں (فَإِنْ اَصَابَكُم قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ)

قرآن میں یہ انداز کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کا راز یہ ہے کہ زندگی کی تمام ترقیاں ان لوگوں کو ملتی ہیں جو مثبت طرز فکر کے حامی ہیں۔ غزوۂ احد کے حادثہ سے اندیشہ تھا کہ مسلمان انتقامی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں گے اور اس طرح وہ مثبت ذہن کو کھو دیں گے۔ اس خطرہ سے بچانے کے لیے قرآن میں مذکورہ قسم کا تبصرہ نازل کیا گیا۔ منفی نفسیات کے طوفان میں انھیں مثبت نفسیات کی طرف موڑ دیا گیا۔

یہی تدبیر دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپانیوں نے اختیار کی۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکا نے جاپان کے صنعتی شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اسے تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد جاپانیوں میں امریکا کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس وقت جاپان کے دانش وروں نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ٹھنڈا کیا کہ اگر امریکا نے ۱۹۴۵ میں ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا ہے تو اس سے پہلے ۱۹۴۱ میں ہم ان کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے۔ اب معاملہ برابر ہو گیا۔ اب آؤ ہم یکسو ہو کر مستقبل کی تعمیر کریں۔ دانش وروں کی اس صحیح رہنمائی نے جاپانی قوم کے لیے تباہی کے باوجود ترقی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔

یہی اس دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہاں وہ لوگ ترقی کرتے ہیں جو منفی تجربہ کے باوجود اپنی مثبت سوچ کو باقی رکھیں، جو مخالف حالات میں بھی اپنے لیے موافق امکانات تلاش کر لیں۔ جو ناکامیوں کے ہجوم میں اپنے لیے کامیابی کا نیا راستہ دریافت کر لیں۔

اس دنیا میں بڑی ترقی صرف ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو خارج سے غیر متاثر رہ کر اپنا راستہ خود اپنی مثبت سوچ کے تحت بنائیں۔

ذہنی ارتقاء

الترمذی نے حضرت سعید الخذری کی ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن خیر کی بات سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ جنت کی منزل تک پہنچ جائے (لن یشبع المومن من خیر یسمعه، حتی یکون منتهاه الجنة) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۸ صفحہ ۹

آدمی کو چاہیے کہ سیکھنے کا جذبہ اس کے اندر مسلسل بیدار رہے۔ وہ ہمیشہ نئی بات سیکھنے کا خواہش مند ہو۔ وہ اپنے تجربہ اور واقفیت میں ہر روز اضافہ کرتا رہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں اس پر موت آجائے۔

معلومات کی دنیا لامتناہی حد تک وسیع ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے ایک سچا انسان کبھی نئی نئی باتیں سیکھنے سے سیر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دماغ کے خزانہ میں ہر صبح و شام اضافہ کرتا رہتا ہے۔

یہی اضافہ انسانی ترقی کا راز ہے۔ اس طرح آدمی کا ذہنی ارتقاء مسلسل جاری رہتا ہے۔ وہ سوچنے اور عمل کرنے کے نئے راستے دریافت کرتا رہتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی حقیقت آتی ہے تو وہ فوراً اس کو اس کی گہرائی تک سمجھ لیتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ پڑتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ کامیاب معاملہ کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے سامنے ایک راستہ بند ہوتا ہے تو وہ اپنے سفر کو جاری رکھنے کے لیے فوراً ہی دوسرا راستہ پا لیتا ہے۔

ایسے آدمی کی بڑھی ہوئی ذہنی استعداد اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں پہچان لے۔ وہ چیزوں کو ویسی ہی دیکھتا ہے جیسی کہ وہ ہیں، نہ کہ دکھانے والے جس روپ میں اس کو دکھادیں۔ ایسا آدمی اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ وہ شبہات کا پردہ پھاڑ کر سچائی کو دیکھے۔ وہ مغالطہ اور استدلال کے درمیان فرق کر سکے۔ وہ جان لے کہ جذباتی نقطۂ نظر کیا ہے اور عقلی نقطۂ نظر کیا۔ ایسے آدمی کے اندر وہ چیز پرورش پاتی ہے جس کو تخلیقی ذہن کہا جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو از سر نو دریافت کرتا ہے، وہ تقلید سے اوپر اٹھ کر مجتہدانہ رائے بنانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی زیادہ بہتر طور پر جان لیتا ہے، اور دوسروں کے بارہ میں بھی اس کے اندر زیادہ صحیح پہچان پیدا ہو جاتی ہے۔ عام انسان اگر صرف انسان ہوتا ہے تو ایسا آدمی پورے معنی میں ایک ترقی یافتہ انسان۔

نفع بخشی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ : خدا نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا۔ اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے، جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح خدا حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے۔ اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے، اسی طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے (الرعد ۱۷)

دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم کیا ہے۔ یعنی جو چیز دوسروں کے لیے مفید ہو وہ یہاں باقی رہے اور جو چیز اس اعتبار سے اپنی افادیت کھو دے وہ اسی طرح پھینک دی جائے جس طرح کوڑے کو بے کار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

نفع بخشی کا آغاز آدمی کے اپنے دماغ سے ہوتا ہے۔ یعنی آدمی دوسروں کا خیر خواہ ہو، وہ اپنے فائدہ کے لیے سوچتے ہوئے یہ بھی اپنے دھیان میں رکھے کہ وہ دوسروں کے لیے کن صورتوں میں فائدہ پہنچانے والا بن سکتا ہے، دوسروں کے بارہ میں اس کے اندر ہمدردی کا جذبہ ہو نہ کہ بے تعلقی کا جذبہ۔

ہر آدمی سماج کے اندر زندگی گزارتا ہے۔ ہر آدمی کی سرگرمیاں سماج کے اندر جاری ہوتی ہیں۔ جس آدمی کا طریقہ یہ ہو کہ وہ اپنا فائدہ چاہے اور صرف اپنے ذاتی تقاضوں کو پورا کرنے میں مشغول رہے، وہ گویا فطرت کے نقشہ کے خلاف کام کر رہا ہے اور جو آدمی فطرت کے نقشہ کے خلاف کام کرے وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کی تعمیر اس طرح کرے کہ اس میں دوسروں کا بھی حصہ ہو۔ فطرت کے نظام کو استعمال کر کے جب وہ کوئی فائدہ حاصل کرے تو اس نے دوسروں کو بھی اس میں ضرور شریک کیا ہو۔ اس کا اصول یہ ہو کہ اس کو لینے کے ساتھ دینا بھی ہے، دوسروں سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ دوسروں کو فائدہ پہنچانا بھی۔

کائنات میں بقا صرف باہمی افادیت کو حاصل ہے۔ خود غرضانہ رویہ کے لیے اس کائنات میں کوئی جگہ نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں یہی اصول انسان کے لیے بھی ہے اور بقیہ کائنات کے لیے بھی۔

امید کا نظام

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— امید میری امت کے لیے اللہ کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اگر امید نہ ہوتو کوئی پودا لگانے والا پودا نہ لگائے اور نہ کوئی ماں کسی بچہ کو دودھ پلائے (الامل رحمۃ من اللہ لامتی ولولاہ لما غرس غارس شجراً ولا ارضعت امٌ ولداً) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۳۴

دنیا کی زندگی میں انسان کو مسلسل تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ اس کو ایسے واقعات کے درمیان سے گزرنا ہوتا ہے جو بظاہر دل توڑ دینے والے ہیں۔ مگر انسان پھر بھی اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اس کا راز امید ہے۔ فطرت نے انسان کے اندر امید کا جذبہ اس طرح رکھ دیا ہے کہ وہ کبھی ختم نہ ہو، وہ برابر انسان کو سرگرم عمل رکھے۔

اس دنیا میں ہر کام تدریج کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسان آج زمین میں بیج ڈالتا ہے اور بہت دنوں کے بعد اس کو اس کا پھل حاصل ہوتا ہے۔ ماں مصیبت اٹھا کر اپنے چھوٹے بچے کی پرورش کرتی ہے حالانکہ وہ وقت ابھی بہت دور ہوتا ہے جب کہ وہ بڑا ہو کر ماں کی خدمت کر سکے۔ لیکن ساری دنیا میں عورت اور مرد مسلسل اسی طرح متحرک ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک کے دل میں چھپا ہوا امید کا جذبہ اس کا سہارا بنا رہتا ہے۔ اگر یہ امید نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں ٹھٹھر کر رہ جائیں۔

تاہم بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی زیادہ بڑے نقصان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی ایسا تجربہ پیش آجاتا ہے جو بظاہر اس کے سارے منصوبے کو تباہ کر دینے والا ہے۔ یہ انسان کے لیے امتحان کا ایک لمحہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بدستور امید کے اوپر قائم رہے، وہ حال کے بجائے مستقبل پر اپنی نظر جمالے تو بہت جلد وہ پائے گا کہ حوصلہ شکنی کے سخت حالات میں بھی اس کے لیے امید کا امکان موجود تھا۔ مایوسی کی آخری حد تک جا کر بھی اس کے امکانات ختم نہیں ہوئے تھے۔ زندگی کے کچھ دروازے اس کے لیے اگرچہ بند ہو گئے لیکن کچھ اور دروازے پھر بھی اس کے لیے کھلے ہوئے تھے جن میں داخل ہو کر وہ اپنا سفرِ حیات کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

انس و محبت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن انس و محبت والا انسان ہوتا ہے۔ اس آدمی میں کوئی خیر نہیں جو نہ دوسروں سے مانوس ہو اور نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں۔ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچانے والا ہو (المومن آلِفٌ مالوفٌ، ولا خیر فیمن لا یالف ولا یُولف وخیر الناس انفعھم للناس) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۳۷

انسان جب اپنی صحیح فطرت پر قائم ہو تو وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیثِ رسولؐ میں بتایا گیا ہے۔ اس کے اندر ایسی صفات ہوتی ہیں جو لوگوں کو اس کی طرف مائل کر دیں۔ اسی طرح وہ خود دوسرے انسانوں سے الفت و محبت کے ساتھ پیش آنے والا انسان ہوتا ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جن کے ملنے سے ایک بہتر سماج وجود میں آتا ہے۔ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں اور دوسروں سے بھی ان کو فائدہ کا تجربہ ہوتا ہے۔

جو لوگ دنیا میں اس طرح جئیں وہ خود بھی کامیاب ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی کامیابی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ پھول کی مانند ہوتے ہیں جو اپنے آپ میں بھی خیر ہوتا ہے اور پورے باغ کے لیے بھی خیر۔

ایسا انسان کینہ و نفرت جیسے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لیے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہر ایک کو اپنا سمجھتا ہے۔ ہر ایک کے لیے اس کے دل میں بہترین تمنائیں ہوتی ہیں۔ جب بھی کوئی شخص اس سے ملتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ پھول سے مل رہا ہے نہ کہ کسی کانٹے سے۔ اس کے پاس بیٹھنا الفت و محبت کے ماحول میں بیٹھنا ہوتا ہے نہ کہ نفرت و وحشت کے ماحول میں بیٹھنا۔

ایسا آدمی جب دوسروں سے ملتا ہے تو وہ اس سے مسکرا کر ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی رعایت کرتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنا اس کے لیے خوشی کا ایک تجربہ ہوتا ہے۔ دوسروں کے کام آنا اس کے لیے خود اپنی شخصیت کی تکمیل کے ہم معنی ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کی خیر خواہی کا جذبہ اس وقت بھی ختم نہیں ہوتا جبکہ دوسروں کی طرف سے اس کو کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے۔

ضرورت نہ کہ حرص

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جو آدمی بقدرِ ضرورت پر قناعت نہ کرے تو وہ ساری زندگی غیر مطمئن حالت میں رہے گا (من لا یجزیہ من العیش مایکفیہ، لم یجد ماعاش مایغنیہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۹۹

مطمئن زندگی کا تعلق زیادہ سے نہیں ہے بلکہ قناعت سے ہے۔ جو آدمی ضرورت کے بقدر پا کر مطمئن ہو جائے، وہی اس نعمت کو پا سکتا ہے جس کو اطمینان کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی ضرورت کے بجائے خواہش کو اپنا معیار بنائے وہ کبھی اطمینان کی زندگی نہیں پا سکتا۔ کیوں کہ ضرورت کی ایک حد ہے، مگر خواہش اور حرص کی کوئی حد نہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ ضرورت اور حرص میں فرق کرے۔ وہ اپنی جد و جہد کا نشانہ ضرورت کی تکمیل کو بنائے نہ کہ خواہش کی تکمیل کو۔ جب ضرورت کو نشانہ بنایا جائے تو ہر چیز اپنی فطری جگہ پر رہتی ہے۔ آدمی ضرورت کی فراہمی کے بعد اس کا وقت پالیتا ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد میں بھی اپنے آپ کو مصروف کر سکے۔ اس کے برعکس جب ضرورت کے بجائے حرص کو نشانہ بنا لیا جائے تو آدمی صرف کمانے والا حیوان بن جاتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا وقت نہیں بچتا جس میں وہ اعلیٰ انسانی تقاضوں کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔

ضرورت کو نشانہ بنانے کی صورت میں زندگی کا نظام اپنے فطری دائرہ میں ہوتا ہے۔ اس کے بجائے جب ضرورت کی حد سامنے نہ رکھی جائے بلکہ اپنی خواہش کو اپنا رہنما بنا لیا جائے تو زندگی کا فطری نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اور اس دنیا میں پُر عافیت زندگی وہی ہے جو فطرت کے نقشہ پر گزاری جائے۔

حرص کا معاملہ ہمیشہ مادی چیزوں میں پیش آتا ہے، نہ کہ اعلیٰ اقدار میں۔ ایسی حالت میں جو آدمی اپنی حرص کے پیچھے دوڑے اس نے گویا اپنی آدمیت کو گھٹا لیا۔ کیوں کہ مادی ضروریات آدمی کی زندگی کا جزء ہیں نہ کہ کل۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعلیٰ انسانی مقاصد کو اپنی زندگی میں پہلی اہمیت کا درجہ دے اور مادی چیزوں کی فراہمی کو دوسرے درجہ میں رکھے۔

زھد کا فائدہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ، تم لوگوں کے محبوب بن جاؤ گے (ازھد فی الدنیا یحبك اللّٰہ وازھد فیما فی ایدی الناس یحبك الناس) ادب الدنیا والدین ۳۰۱

عزت و محبت کا راز بے نیازی ہے۔ آدمی کے اندر جتنا زیادہ بے نیازی کی کیفیت پیدا ہوگی اتنا ہی زیادہ لوگوں کے لیے اس کی کشش بڑھتی چلی جائے گی۔

خدا سے قریب ہونے کا راز دوسروں سے دور ہونا ہے۔ آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں سے بے رغبت ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ خدا کے بارے میں سوچے گا اور خدائی چیزوں میں مشغول ہوگا۔ اس کے برعکس آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں میں اپنا دل لگائے گا اتنا ہی وہ خدا کی طرف سے غفلت میں پڑ جائے گا۔ دوسری چیزوں سے تعلق کا بڑھنا خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو گھٹانا ہے۔ اسی طرح خدا سے اپنے تعلق کو بڑھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا قلبی تعلق دوسری چیزوں کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔

لوگ ایسے آدمی کی عزت کرتے ہیں جس کو وہ اپنے سے اونچا سمجھتے ہوں۔ جو آدمی انھیں اپنے برابر یا اپنے سے کم دکھائی دے اس کے لیے لوگوں کے اندر عزت و قدر دانی کا اعلیٰ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی سماج میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں سے بے نیاز بنا ہوا ہو، وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہ ہو، ایسا انسان اپنے آپ دوسروں کے درمیان اونچا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ کسی کوشش کے بغیر وہ دوسروں کی نظر میں محترم بن جاتا ہے۔

دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی آدمی کو بیک وقت دو فائدے دیتی ہے۔ ایک طرف وہ پُر عافیت زندگی کا مالک بن جاتا ہے، وہ اعلیٰ حقیقتوں میں جینے لگتا ہے۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ سماج کے درمیان اپنے آپ عزت و احترام کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی نظر میں بھی باعزت آدمی بن جاتا ہے اور دوسروں کی نظر میں بھی۔

زاھدانہ زندگی نام ہے چھوٹی چیز کو کھو کر زیادہ بڑی چیز کو پا لینا۔

علم کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ علم خزانہ کی مانند ہے اور اس کی کنجی سوال ہے۔ اللہ تم پر رحم کرے تم سوال کیا کرو۔ کیونکہ علم میں تین لوگ اجر پاتے ہیں۔ کہنے والا، سننے والا اور لے لینے والا (العلم خزائنُ ومفتاحه المسألة، فاسألوا رحمکم الله، فانّما يُوجرُ في العلم ثلاثة، القائلُ والمستمع والآخذُ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۱۰

علم کی دنیا ایک لامحدود دنیا ہے۔ یہ دنیا معلومات کے خزانہ سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو سارے علوم اور تمام معلومات اپنے دماغ میں بھرے ہوئے ہو۔ کسی کے پاس اس کا کچھ حصہ ہے اور کسی کے پاس اس کا کچھ۔

مختلف انسانوں کے پاس جمع شدہ یہ خزانہ آپ کو کس طرح ملے، اس کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس کے طالب بن جائیں۔ آپ کے دل میں ان کو حاصل کرنے کا بے پناہ شوق پیدا ہو جائے۔ جب ایسا ہوگا تو آپ لوگوں سے پوچھنے لگیں گے تاکہ ان کے پاس جمع شدہ معلومات کو لے کر اپنے علمی ذخیرہ کو بڑھائیں۔ آپ اہل علم کی کتابیں پڑھیں گے تاکہ ان کے اندر علم کا جو خزانہ بند ہے، اپنے آپ کو اس کا حصہ دار بنا سکیں۔

انسان کی ساری اہمیت علم کے اعتبار سے ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ علم والا ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ قابل قدر ہوگا۔ زندگی کی ہر ترقی براہ راست طور پر علم سے جڑی ہوتی ہے، جتنا زیادہ علم اتنا ہی زیادہ ترقی۔

علم کے معاملہ میں ہر آدمی کی تین میں سے کوئی ایک حیثیت ہوتی ہے ــــ قائل، مستمع، آخذ۔ یعنی کہنے والا اور سننے والا اور ماننے والا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جس حیثیت میں پائے، وہ اس کا پورا حق ادا کرے۔ اگر اس کو بولنے کا موقع مل رہا ہے تو وہ ذمہ دارانہ کلام کرے۔ وہ وہی بولے جو اس کو بولنا چاہیے، وہ ایسا کلام نہ کرے جو حقیقتِ واقعہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس کا بولنا حقیقت کے اظہار کے لیے ہو نہ کہ خود نمائی کے لیے۔ اسی طرح جو سن رہا ہے اس پر بھی لازم ہے کہ وہ سننے کا حق ادا کرے۔ وہ کہی ہوئی بات کو پورے دھیان کے ساتھ سنے اور اس کو اسی معنی میں لے جس معنی میں لینے والے نے اس کو کہا ہے۔

حقیقت کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— تھوڑا علم زیادہ عبادت سے بہتر ہے (قليل العلم خيرٌ من كثير العبادة) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۱۴

اس حدیث میں جو تقابل ہے وہ حقیقی علم اور ظاہری عبادت کے درمیان ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف علم اور عبادت کے درمیان۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ظاہری عبادت بہت زیادہ کرے تو اتنی قابل قدر بات نہیں ہے جتنا یہ بات کہ ایک شخص علم میں محنت کرے اور اس سے حکمت و معرفت کا خزانہ حاصل کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود عبادت کا تعلق علم سے بہت گہرا ہے۔ جو آدمی گہرا علم رکھتا ہو وہ اسی کے ساتھ گہری معرفت والا انسان ہوگا۔ اور یہ گہری معرفت ہی عبادت کی اصل روح ہے۔ عبادت صرف ظاہری مراسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس اسپرٹ کا نام ہے جو عبادت کے اندر موجود ہوتی ہے۔ یہ اسپرٹ ہی عبادت کو عبادت بناتی ہے اور یہ اسپرٹ علم کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

علم آدمی کے ذہن کو جگاتا ہے۔ وہ اس کو بے شعوری سے نکال کر شعور کے مرحلہ میں پہنچاتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو درست طور پر استعمال کرسکے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھے اور اس کے لیے کامیاب منصوبہ بندی کرے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے اوپر بیک وقت دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک، خدا کی نسبت سے۔ اور دوسرے، انسان کی نسبت سے۔ انہی دونوں ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرنے کا نام کامیابی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک ذمہ داری بھی اگر چھوٹ جائے تو آدمی کی زندگی ادھوری رہ جائے گی۔ وہ کامل انسان کہلانے کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔ علم انہی دونوں ذمہ داریوں کا صحیح شعور دیتا ہے۔ وہ آدمی کو کامل منصوبہ بندی کے قابل بناتا ہے۔

کسی چیز کی اہمیت اس کے باطن سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے خارج سے۔ وہی انسان کامیاب ہے جو باطنی اہمیت والی چیز اپنے اندر رکھتا ہو۔ صرف خارجی ظواہر نہ خدا کی نظر میں قابل قدر ہیں اور نہ انسان کی نظر میں۔

کامیابی کا راز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— تم اپنی پسندیدہ چیز کو صرف اس وقت پا سکتے ہو جب کہ تم اپنی ناپسندیدہ چیز پر صبر کرو۔ اور جو کچھ تم چاہتے ہو اس کو تم اپنی خواہشوں کو چھوڑے بغیر حاصل نہیں کر سکتے (انکم لا تنالون ما تحبون الا بالصبر علی ما تکرھون ولا تبلغون ما تھوون الا بترک ما تشتھون) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۸۶

موجودہ دنیا فطرت کے جس اصول پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پانے کے لیے کھونا پڑتا ہے۔ یہاں ایک پسندیدہ چیز کو حاصل کرنے کے لیے کسی دوسری پسندیدہ چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں کامیابی کی منزل پر پہنچنا اس کے لیے مقدر ہے جو راستہ کی ناکامیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسی کا نام صبر ہے۔ صبر کی صفت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی مطلوب چیز کو حاصل کرنے کی ضروری قیمت ادا کر سکے۔ صبر آدمی کو حوصلہ مند بناتا ہے۔ صبر کے ذریعہ آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ان ناخوش گواریوں کو پرسکون طور پر جھیل سکے، جن کا پیش آنا ہر معاملہ میں ضروری ہے۔ خواہ وہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا معاملہ ہو۔

درخت سے پھول لینے کے لیے آدمی کو کانٹوں سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سماج کے اندر اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان ناخوش گواریوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو لازمی طور پر دوسروں کی طرف سے پیش آتی ہیں۔ آدمی کا مقصد جتنا زیادہ بلند ہو اتنی ہی زیادہ دشواریاں اس کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ آدمی اس قسم کی تمام ناگواریوں کو گوارا کرے تاکہ وہ اپنی پوری قوت کو یکسوئی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں لگا سکے۔

ناخوش گواریوں پر صبر کرنا اپنے اندر ایک مثبت پہلو رکھتا ہے۔ اس سے قوتِ ارادی بیدار ہوتی ہے۔ وہ آدمی کے عملی جذبہ کو بڑھاتی ہے۔ اس طرح آدمی مزید اضافہ کے ساتھ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

اس دنیا میں ایک چیز کو پانے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں آدمی اپنی ایک خواہش کی تکمیل اس وقت کر پاتا ہے جبکہ وہ اپنی ایک اور خواہش کو اس کی خاطر چھوڑ دے۔

علم کی طلب

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــــ اچھا سوال کرنا آدھا علم ہے (حسن السوال نصف العلم) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۱۱

اچھا یا گہرا سوال کون کرتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے، جس کی بابت وہ سوال کررہا ہے۔ مسئلہ کے بارہ میں اچھی واقفیت کے بغیر کوئی اچھا سوال نہیں کرسکتا۔ اچھا سوال اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی علم کے نصف حصہ کو پا چکا ہے، اور اب جواب دینے والے کا کام یہ ہے کہ وہ بقیہ نصف کے بارہ میں بتا کر اس کی واقفیت کو مکمل کردے۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے پاس علم کا جو ذخیرہ ہے۔ اس کو اپنے لیے حاصل کریں تو سب سے پہلے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ اپنی علمی استعداد کو بڑھانے کے بعد ہی آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے سے واقعی استفادہ کرسکے۔ یا کسی کی لکھی ہوئی کتاب کو پڑھ کر اس کی معلومات کو اپنے ذہن میں اتار سکے۔

سوال اور جواب یا سیکھنا اور سکھانا یہ یک طرفہ عمل نہیں ہے بلکہ وہ دوطرفہ عمل ہے۔ یعنی سوال کرنے والا یا سیکھنے والا ذہنی طور پر جتنا زیادہ تیار ہوا اتنا ہی زیادہ وہ جواب دینے والے یا سکھانے والے کی بات کو سمجھے گا اور اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ یعنی اگر آپ کے پاس علم کا نصف حصہ موجود ہو تو اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص آپ کو علم کا بقیہ نصف حصہ دے سکے۔ یہ دوطرفہ معاملہ ہے نہ کہ یک طرفہ معاملہ۔

دنیا علم سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا ایک دریا اہلِ علم اور اہلِ دانش لوگ ہیں۔ اس کا دوسرا دریا وہ کتابیں ہیں جو دنیا کے بہترین دماغوں نے لکھی ہیں اور وہ چھپ کر کتب خانوں میں اکٹھا ہوگئی ہیں۔ اس کا تیسرا ذریعہ ہمارے سامنے پھیلی ہوئی کائنات ہے، اس کا ہر جزء اپنے اندر معرفت کا ایک چھپا ہوا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم کا طالب ہو وہ کسی بھی لمحہ کسی بھی مقام پر اپنے لیے علم کا ایک کھلا ہوا خزانہ پالے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں علم کا طالب ہو، وہ اپنے اندر پانے کا استحقاق پیدا کرچکا ہو۔

نصیحت پذیری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— سعادت مند وہ ہے جو اپنے سوا دوسرے سے نصیحت حاصل کرے (السعیدُ من وُعظ بغیرہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۵۶۱

نصیحت حاصل کرنے کا تعلق نصیحت پسند مزاج سے ہے۔ کوئی آدمی جتنا زیادہ نصیحت کو قبول کرنے کا مزاج اپنے اندر رکھتا ہو اتنا ہی زیادہ وہ نصیحت حاصل کرے گا۔ خود اپنے اندر نصیحت پسندی کا مزاج نہ ہو تو وہ کچھ بھی نصیحت نہ حاصل کر سکے گا، خواہ وہ نصیحتوں کے ڈھیر کے درمیان زندگی گزار رہا ہو۔

جس آدمی کے اندر نصیحت لینے کا مزاج بیدار ہوگیا ہو، وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی اس کو بتائے تب اس کو نصیحت ملے۔ بلکہ وہ دوسروں کو دیکھ کر ان سے نصیحت پکڑتا رہتا ہے۔ وہ کسی کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اپنے آپ اس کے اندر اس کی پیروی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ خود بھی ویسا ہی کرنے لگتا ہے حتی کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے غلط بات بولے یا غلط کام کرے تو ایسا واقعہ بھی اس کے لیے نصیحت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ اس کو سن کر یا دیکھ کر چوکنا ہو جاتا ہے اور اپنے اندر یہ عزم کرلیتا ہے کہ وہ کبھی ایسی بات نہیں بولے گا اور نہ کبھی ایسا کام کرے گا۔

اس معاملہ میں انسان کی مثال بارش جیسی ہے۔ کسی میدان میں بارش ہو تو وہ چٹانوں پر بھی گرتی ہے اور کھیت کی زرخیز زمینوں پر بھی۔ لیکن چٹان کے اوپر گرنے والا پانی اوپر اوپر بہہ جاتا ہے وہ اس کے اندر داخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کھلی زمین میں جو پانی گرتا ہے وہ اس کے اندر جذب ہو جاتا ہے اور ہری بھری فصل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

کوئی آدمی بھی کامل نہیں۔ ہر آدمی کی ضرورت ہے کہ اس کو نصیحت ملے تاکہ وہ اپنی اصلاح کرکے اپنی شخصیت کو مکمل کر سکے۔ لیکن یہ عمل نصیحت پذیر ذہن کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ سعادت مند شخص وہ ہے جو اپنے ذہن کو نصیحت سننے اور نصیحت قبول کرنے کے لیے کھلا رکھے۔ کوئی نفسیاتی پیچیدگی اس کے لیے نصیحت کو قبول کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ ہر حال میں نصیحت سے فائدہ اٹھائے، حتی کہ اس کی نصیحت پذیری اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ وہ بگڑے ہوئے لوگوں سے بھی اصلاح کا سبق حاصل کرلے۔

نصیحت اگرچہ دوسرے سے ملتی ہے لیکن وہ آدمی کا اپنا معاملہ ہے، وہ ہر آدمی کی خود اپنی ضرورت ہے۔

دانش مندی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دانش مند سے رہ نمائی حاصل کرو تم راہ یاب ہو گے اور اس کے خلاف نہ کرو ورنہ تم پشیمان ہو گے (استرشدوا العاقل ترشدوا ولا تعصوہ فتندموا) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۴۷۵

انسان سب یکساں نہیں ہوتے۔ کسی کے پاس علم کم ہوتا ہے اور کسی کے پاس علم زیادہ، کوئی زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اور کوئی کم تجربہ کار۔ اسی طرح کوئی شخص فطری طور پر زیادہ سوجھ بوجھ والا ہوتا ہے اور کوئی کم سوجھ بوجھ والا۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک آدمی اگر اپنے اندر کمی پائے تو وہ دوسرے کے ذریعہ اپنی اس کمی کو پورا کرے۔

یہ فطرت کا نظام ہے اور جو چیز خود فطرت کے نظام سے تعلق رکھتی ہو، اس سے موافقت کرکے ہی آدمی کامیاب ہوتا ہے۔ فطرت کے نظام کی خلاف ورزی کرنے کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جانے اور اسی کے ساتھ وہ دوسرے سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ جو آدمی اس طرح بے لاگ طور پر اپنے آپ کو اور دوسرے کو جانے گا اس کا مزاج یہی ہو گا کہ ہر موقع پر وہ ان لوگوں سے رہنمائی حاصل کرے گا جو اس سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں یا علم اور تجربہ میں اس سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور ایسے لوگوں سے اس کو جو رہ نمائی ملے گی اس کو وہ کھلے دل سے قبول کرلے گا۔ کیونکہ وہ جانے گا کہ ایسے موقع پر کوئی اور عمل کرنا اس کو تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔

کوئی آدمی جب دانش مند کی بات کو نہیں مانتا تو وہ کیوں ایسا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے معاملہ کو اپنے لیے ساکھ کا مسئلہ بنا لیتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے دوسرے کی بات مان لی تو میں اس کے مقابلہ میں نیچا ہو جاؤں گا۔ مگر اس طرح کی سوچ سراسر نادانی کی سوچ ہے، اس طرح کے معاملہ کو ساکھ یا عزت نفس کا مسئلہ بنانا اپنی کامیابی اور ترقی کے دروازہ کو خود اپنے ہاتھوں سے بند کرلینا ہے۔ دانش مند کی بات کو نہ ماننا بظاہر دوسرے کی بات کو نہ ماننا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ خود اپنا انکار ہے۔ آدمی جب کسی دوسرے کی ایک سچی بات کو نہیں مانتا تو وہ گویا خود اپنی فطرت اور اپنے ضمیر کو رد کر رہا ہے، یہ بلاشبہ سب سے بڑا نقصان ہے۔

انجام کا لحاظ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جب تم کسی کام کا قصد کرو تو پہلے اس کے انجام کے بارہ میں سوچو، اگر وہ درست ہو تو اس کو کرو اور اگر وہ درست نہ ہو تو اس سے رک جاؤ (اذا هممت بامر ففكر في عاقبته، فان كان رشداً فامضه وان كان غيا فانته عنه) ادب الدنیا والدین، صفحہ ۵۶۲

کائنات میں صرف خدا کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جس کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ کوئی فعل کرے تو اسے اس کے برے انجام کا کوئی خوف نہ ہو (ولا يخاف عقبها) جہاں تک انسان کا تعلق ہے وہ ایک محدود اور بے زور مخلوق ہے۔ اس کے لیے ایسی کارروائی ممکن نہیں جس میں اس کے انجام پر غور نہ کیا گیا ہو، اور اگر کوئی شخص ایسی کارروائی کرے تو اس کا برا نتیجہ سب سے زیادہ اسی کو بھگتنا پڑے گا۔

انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں اس کے جیسے دوسرے بہت سے انسان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے اغراض کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ مختلف قسم کی مادی طاقتیں ہیں جو خود اپنے قانون کے تحت عمل کر رہی ہیں۔ اس طرح گویا انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں اس کو مخالفین سے بھرے ہوئے ماحول میں اپنے مقصد کے لیے عمل کرنا ہے۔

ایسی حالت میں انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی کوئی عمل شروع کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر غور کرے، وہ ایک طرف اپنی طاقت کا اندازہ کرے اور دوسری طرف بے لاگ طور پر یہ دیکھے کہ خارجی دنیا میں کتنے اسباب اس کے موافق ہیں اور کتنے اسباب اس کے مخالف۔ آدمی کو چاہیے کہ اس طرح کے گہرے جائزہ کے بعد وہ اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔

اگر آپ ایسا کریں کہ حالات کے گہرے جائزہ کے بغیر اپنی کارروائی شروع کر دیں تو عین ممکن ہے کہ آپ کا عمل الٹا نتیجہ پیدا کرے۔ نہ صرف یہ کہ آپ کو متوقع فائدہ حاصل نہ ہو بلکہ اقدام سے پہلے آپ کو جو کچھ حاصل تھا وہ بھی غلط اقدام کے نتیجہ میں تباہ ہو جائے۔ اس طرح کا انجام بھگتنے کے بعد اگر آپ اس کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرائیں تو یہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہوگا۔ اس لیے کہ آپ کو جو نقصان ہوا وہ خود آپ کی غلطی کی قیمت تھی جو حالات نے بے رحمانہ طور پر آپ سے وصول کی۔

عقل مند کون

اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ـــــ عقل مند وہ نہیں ہے جو خیر اور شر کو جانے بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے خیر کون سا ہے (لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین) العبقریات الاسلامیہ للعقاد، صفحہ ۵۰۵

زندگی کا معاملہ بے حد نازک معاملہ ہے۔ یہاں ہر انسان کو آزادی ہے۔ ہر انسان اپنی اپنی دوڑ لگا رہا ہے۔ ہر انسان اپنے مقصد کے حصول میں مصروف ہے۔ اس لیے یہاں کسی کو بھی اپنے عمل کے لیے کھلا میدان نہیں ملتا۔ ہر ایک کو بھری ہوئی سڑک پر اپنا راستہ طے کرنا ہوتا ہے۔ اس صورت حال نے اس کو ناممکن بنا دیا ہے کہ آدمی اپنی خواہش کے مطابق اپنے لیے کامل معنوں میں ایک معیاری دنیا کو پالے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی آدمی کے لیے جو انتخاب ہے وہ خیر اور شر کے درمیان نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ دو شر میں سے کمتر شر کون سا ہے۔ اس دنیا میں کمتر شر پر راضی ہونا دانش مندی ہے اور کمتر شر پر راضی نہ ہو کر خیر کامل کے لیے دوڑنا بے دانشی، کیوں کہ ایسا خیر اس دنیا میں کسی کو ملنے والا ہی نہیں۔

کمتر شر پر راضی ہونے والا اپنے لیے عمل کا آغاز پالیتا ہے۔ اس کا تعمیری عمل فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ کمتر شر پر راضی نہ ہوں وہ غیر ضروری طور پر اس سے لڑ جائیں گے۔ صرف اس لیے کہ ایک کمتر شر کو ہٹا کر دوبارہ دوسرے کمتر شر کو اپنے اوپر مسلط کر لیں اور مزید اس نقصان کو بھگتیں کہ تعمیر و ترقی کے لیے عمل کرنے کے جو مواقع انھیں حاصل تھے وہ استعمال ہوئے بغیر رہ گئے۔

جو آدمی حقیقت کا گہرا شعور رکھتا ہو وہ یہی کرے گا کہ کمتر شر پر راضی ہو کر اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کے میدان میں لگا دے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ گہری سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں وہ خیر کامل کے حصول کے نام پر بے معنی لڑائی چھیڑ دیں گے اور جب اس کا یہ انجام سامنے آئے گا کہ ملے ہوئے مواقع بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے تو وہ اپنے مفروضہ دشمنوں کی مذمت کرنے لگیں گے۔ حالانکہ جو نقصان انھیں پیش آیا ہو گا وہ خود ان کی نادانی کا نتیجہ ہو گا نہ کہ کسی دوسرے کی ظلم و زیادتی کا نتیجہ۔

ملے ہوئے پر راضی ہونا آدمی کے لیے ترقی کا دروازہ کھولتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو جان لیں وہی اس قابل ہیں کہ انھیں دانش مند کہا جائے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فیصد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فیصد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18

Title	Price
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	85.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	—
An Islamic Treasury of Virtues	—
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	95.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Soul of the Qur'an	125.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Muslim Prayer Companion	—
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
Uniform Civil Code	10.00

اُردو

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	55/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاء اسلام	35/-
رازِ حیات	65/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
منزل کی طرف	2/-
فکرِ اسلامی	50/-
طلاق اسلام میں	3/-
دینِ انسانیت	60/-
شتمِ رسول کا مسئلہ	40/-
مطالعۂ سیرت	—
ڈائری جلد اول	80/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	—
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	7/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبرِ اسلامؐ	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	—
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
امہات المومنین	20/-
تصویرِ ملت	85/-
دعوتِ اسلام	50/-
دعوتِ حق	40/-
نشری تقریریں	65/-
اسفارِ ہند	–
اسلام ایک تعارف	–
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	–
تعددِ ازواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	–
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	–
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-
یکساں سول کوڈ	5/-
اسلام کیا ہے	8/-

ہندی

کتاب	قیمت
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	–
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوش	8/-
پوتر جیون	8/-

RNI 28822/76 • U(SE) 12/98
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98